ولایت در قرآن

تالیف : آیت اللہ جوادی آملی

ترجمہ : ثاقب نقوی

مصباح القرآن (ٹرسٹ) لاہور

مضامین قرآن

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

10,034

NAJAFI BOOK LIBRARY
[illegible] by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No 11 M.L Heights
Mirza Kaleej Baig Road
[illegible] Bazar Karachi-[illegible] Pakistan

Acc. No. 10-034 Date 13/1/04
Section .... Status ....
D.D. Class ....
NAJAFI BOOK LIBRARY

محفوظ بک ایجنسی
مارٹن روڈ کراچی
Tel: 4124286-4917823 Fax: 4312882
E.mail: anisea@cyber.net.pk

ولایتؑ در قرآن

آیت اللہ جوادی آملی

ترجمہ

شاقب نقوی

مصباح القرآن ٹرسٹ

۱۰، گنگا رام بلڈنگ، شاہراہ قائداعظم لاہور

کتاب ——— ولایت در قرآن

مؤلف ——— استاد آیت اللہ جوادی آملی

ترجمہ ——— ثاقب نقوی

کتابت ——— محمد اقبال

ناشر ——— مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز

زیر اہتمام ——— مصباح القرآن ٹرسٹ ۔ لاہور

طابع ——— معراج دین پرنٹرز

تاریخ اشاعت ——— مارچ ۱۹۹۷ء

ایڈیشن ——— اوّل

ہدیہ ——— ۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر ۔ اُردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

عرضِ ناشر

قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس میں دنیا و آخرت کی ہر منزل اور ہر مرحلے کے بارے میں ہدایت و رہنمائی موجود ہے لہٰذا اس میں ولایت سے متعلق بھی واضح آیات و بیانات ملتے ہیں۔ وِلایت (بہ کسرِ واؤ) کے معنی محبت و نصرت ہیں لیکن وَلایت (بہ فتحِ واؤ) کے معنی تدبیر و سرپرستی ہیں۔

ولایت محبت و نصرت یہ ہے کہ دو چیزیں باہمی قُرب کی بدولت ایک دوسری کی دوستی اور مدد سے بہرہ مند ہوتی ہیں۔ یہ بات انسانوں میں ایک دوسرے پر فرض کی حیثیت رکھتی ہے نیز خدا و انسان اور خدا و بندگان کے درمیان بھی لازم ہے۔

خدائے تعالیٰ نے مومنین کو کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ ولایت محبت و نصرت سے منع فرمایا ہے تاکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر ان کو اپنا حاکم و سرپرست مان کر ان کے تابع و محکوم نہ بن جائیں۔

ولایت محبت و نصرت اور ولایت تشریعی خداوند تعالیٰ کی ولایات عمومی ہیں جبکہ ولایت حکومت اور ولایت تکوینی اس کی ولایات خصوصی ہیں۔

ولاء، ولایت، مولیٰ، متولی اور ولی کی اصل ایک ہی ہے ۔۔ خداوند کریم کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم "ولی" بھی ہے اور انسان کو خدا کے ساتھ اپنے تعلق کے نتیجے میں خدا کے اسم "ولی" کا مظہر بننا چاہیئے جیسا کہ بعض انبیاءؑ و ائمہ اور صالحین خدا کے ان اسماء صفات میں سے ایک یا ایک سے زیادہ ناموں کے مظہر بن کر قابلِ رشک

کردار و عمل اور حیران کن معجزات و کرامات کے حامل رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "ولایت در قرآن" ولایت کی حقیقت و ماہیت اور اس کے اقسام سے متعلق قرآنی تصریحات پر مشتمل ہے جو آیت اللہ جوادی آملی کی اہم تالیف ہے۔ اس کا فارسی سے اُردو ترجمہ ہمارے معروف ادیب و مبلغ مولانا ثاقب نقوی نے کیا ہے۔ ہم نے اُردو خواں مسلمانوں کے استفادے کے لئے اسے خاص اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ آپ اس نفع بخش کتاب کی توسیع اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے کر اس کے فیوض کو عام کریں گے۔

اراکین
مصباح القرآن ٹرسٹ

فہرست مضامین

مقدمہ	۱۱
درس ۱	۴۳
ولایت ـــ لغت میں	″
ولایت ـــ قرآن میں	۴۴
اشراقی اور مقولی نسبت	″
قرآن میں خطاب کی قسمیں	۴۶
ولایت نسبت اشراقی ہے	۴۷
"ولی" اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں ہے	″
انسان کو اسم "ولی" کا مظہر ہونا چاہیے۔	۴۸
ظہورِ حقیقت	۵۲
نتیجۂ سخن	۵۴
درس ۲	۵۵
گفتگو کی منطقی تنظیم	″
ولایت کیا ہے؟	″
ولایت کا وجودِ خارجی	۵۷
درس ۳	۶۰
یاد دہانی	″
ولایت کی ماہیت	″
ولائے نصرت و محبت	۶۱
بندہ ـــ ولایت کا آغاز کرنے والا	۶۲
ماہیتِ ولایت ـــ قرآن کی نظر میں	۶۵
ولایتِ باطل کا انجام	۶۸
ولایتِ حق اور ولایتِ باطل میں امتیاز	۷۰
حاصلِ سخن	۷۱
درس ۴	۷۳
یاد آوری	۷۵
ولایت کا وجودِ خارجی	″
انسان ولی اللہ	۷۶
ولایتِ الٰہی کی اقسام	″
تحققِ ولایت کے اسباب	۷۸

قرآنِ کریم میں ولایت ۷۸
ثبوت و اثبات میں واسطہ۔ " "
ولایتِ باطل ۷۹
قرب و ولایت کا اتحاد نتیجہ کے
اعتبار سے۔ ۸۰

درس ۵ ۸۴

ولایت و موالات "
تاثیرِ عمل ۸۶
ولایت، آیات کی روشنی میں ۸۸
حاصلِ سخن ۹۲

درس ۶ ۹۷

یاد آوری "
محبتِ دُنیا بھی ایک رکاوٹ ہے ۹۸
آیات میں انحصارِ ولایت ۱۰۰
"ولی" اللہ کے اسمائے حُسنیٰ میں
سے ہے۔ ۱۰۵

درس ۷ ۱۰۷

ولی کون ہے؟ ۱۰۷
معرفت و اخلاص راہِ ولایت میں
ناگزیر ہیں۔ "
عبادت ہی تقرّب کا ذریعہ ہے ۱۰۹
عبادت ـــــ زینۂ یقین "
توحیدِ افعالی ـــ حاصلِ عبادت ۱۱۰
آیات میں توحیدِ افعالی ۱۱۱
آئینہ ہونے کا مفہوم ۱۱۲
مظہریتِ انسان ۱۱۳
امر بین الامرین کا مفہوم ۱۱۴
توحیدِ افعالی کا اثر انسانی کردار پر ۱۱۵

درس ۸ ۱۱۷

توحیدِ افعالی اساسِ ولایت ہے "
بندوں کے ذمہ صرف غیرِ خدا کی
مالکیت نہ ماننا ہے۔ ۱۲۱
حصولِ ولایت کے لیے ہدایتِ
رسولِ اکرمؐ۔ ۱۲۳

درس ۹ ۱۲۸

اخلاص کے بارے میں آیات ۱۲۸

واصب و خالص میں فرق ۱۲۹

اوّلین مسلمان ـــــ رسولِ اکرمؐ ۱۳۰

کلامِ معصومینؑ میں معرفت ۱۳۱

خوفِ عقلی اور خوفِ نفسی ۱۳۳

اخلاص ـــــ اقوالِ معصومینؑ میں ۱۴۰

درس ۱۰

۱۴۳

اصالتِ معرفت ″

صمدیت ـــــ سرچشمہ ولایت ۱۴۴

صمدیتِ انسان کے مراتب ″

معرفت کے مرحلہ میں صمدیت کی رکاوٹیں ۱۴۵

عمل کے مرحلہ میں صمدیت کی رکاوٹیں ۱۴۶

اعمال کی فوری جزا ″

اتمامِ حجت ۱۴۸

قیامت کی یاد گناہ سے بچاتی ہے ۱۵۱

درس ۱۱

۱۵۳

صمدیت کا کمال و تمامیت سے تعلّق ″

علم کی تمامیت اور کمال ۱۵۴

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حق ″

عمل کی تکمیل

دینِ الٰہی، مظہرِ صمد

اللہ کے علم و قدرت کا صمدیت و

ولایت سے تعلق

ولایت میں علم و عمل کا کردار

درس ۱۲

اصالتِ معرفت

ادراک پر کنٹرول کے ذریعہ

جذبات پر تسلّط۔

امیرالمومنینؑ کے فرمودات

درس ۱۳

عبادت و ولایت

قربِ نوافل کی حدیث

امیرالمومنینؑ کا فرمان

ولایت اور تفویض و توکیل میں فرق

درس ۱۴

مقدمۂ اوّل

اصطلاحِ اوّل

اصطلاحِ دوم ۱۹۲
اصطلاحِ سوم "
اصطلاحِ چہارم "
مقدمۂ دوم ۱۹۳
مقدمۂ سوم ۱۹۴
مقدمۂ چہارم "
خدا کی ولایت تکوینی اور تشریعی ۱۹۶

درس ۱۵ ۲۰۱

عرضی اور طولی ولایتوں کی نفی "
ولایتِ الٰہی کا ظہور اور اس کی تجلی ۲۰۲
قیامت حضرتِ حق کی ولایت کے ظہور کا مقام ۲۰۴
قرآن میں ولایتِ الٰہی کی لامحدودیت ۲۰۶
بُرہانِ اوّل ۲۰۷
بُرہانِ دوم "
بُرہانِ سوم وچہارم ۲۰۸

درس ۱۶ ۲۱۱

برہانِ پنجم "
غیرِ خدا سے سلبِ حاکمیت ۲۱۲
حُکمِ الٰہی اور حُکمِ جاہلی ۲۱۵
حاکمیت نبی اور احکامِ الٰہی کا پیش کرنا ۲۱۸

درس ۱۷ ۲۲۲

برہانِ ششم "
برہانِ ہفتم ۲۲۴
بُرہانِ ہشتم ۲۲۵

درس ۱۸ ۲۳۱

ولایتِ عامّہ وولایتِ خاصہ "
ولایت میں تفویض کی نفی ۲۳۵

درس ۱۹ ۲۴۱

انبیاء کے علاوہ دیگر اولیائے الٰہی "
کے لیے ولایتِ تکوینی کا اثبات۔ "
پہلا نمونہ: حضرت مریمؑ ۲۴۲
دوسرا نمونہ: آصف بن برخیا ۲۴۳
نکتۂ اوّل ۲۴۸
نکتۂ دوم "
نکتۂ سوم ۲۴۹
نکتۂ چہارم "
نکتۂ پنجم ۲۵۰
نکتۂ ششم ۲۵۲
نکتۂ ہفتم ۲۵۳

درس ۲۰

۲۵۴
تیسرا نمونہ : مادرِ حضرت موسیٰؑ ״
چوتھا نمونہ : حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ ۲۵۶
پانچواں نمونہ : اصحابِ کہف ۲۵۸
چھٹا نمونہ : حضرت خضرؑ ۲۶۱
ساتواں نمونہ : اہل ایمان کی گواہی ۲۶۳

درس ۲۱

۲۶۸
انسان کے ادراک و حرکت میں
کارِ خدا کا ظہور۔ ״
معرفت نفس اور کشفِ ولایت
کا طریقہ۔ ۲۶۹
خوارق کی اقسام اور معجزہ و کرامت
میں فرق۔ ۲۷۲
اولیاء سے ظہورِ کرامت پر اعتراض اور
اس کا جواب۔ ״
اولیائے الٰہی کے مختلف پہلو اور ان
کی مصروفیات۔ ۲۷۴
"روح القدس" کے ذریعہ اولیائے الٰہی
کی تائید۔ ۲۷۴
ولایتِ الٰہی کے مظاہر ۲۷۷

٭ ٭ ٭

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ وایاہ نستعین

مُقدّمہ

① علم اگرچہ ہستیِ مجرد سے عبارت ہے اور تمام درجاتِ ہستی اور خصوصاً آلایشِ مادہ سے منزّہ مرحلۂ کمال ہے لیکن کمال بذاتِ خود بہت سے مراتب کا حامل ہے، ان مراتب میں سے بعض کا تعلق عقلِ انسانی کے مرحلے سے ہے اور بعض کا وہم وخیال وغیرہ کے مرحلے سے۔ وہ علم کہ جو تجردِ وہمی یا خیالی تک ہو ہرگز اس علم کا ہمسر نہیں ہو سکتا کہ جو تجردِ عقلی کی حد میں ہو لہٰذا اس اعتبار سے درجاتِ علم میں قابل لحاظ تفاوت ملتا ہے جیسے حیات عینِ کمالِ وجودی ہونے کے باوصف بہت سے ایسے مراتب کی حامل ہے کہ جو ہرگز ایک دوسرے کے برابر نہیں ہیں۔

علم ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے کسی ذات کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور یہ اپنے متعلق کہ جو "معلوم" ہوتا ہے کو عالم کے لئے روشن و واضح کرتا ہے۔ علم کا اپنے معلوم سے ارتباط مستقیم ہوتا ہے۔ معلومات ایک جیسی نہیں ہوتیں، کیونکہ بعض معلومات وجود حقیقی کی حامل ہوتی ہیں۔ اور بعض اس سے عاری ہوتی ہیں اور فقط وجود اعتباری کی بنیاد پر موجود کہلاتی ہیں۔ حقیقتِ غیر اعتباری کے حامل بھی بعض ثابت و دائمی موجود ہیں اور بعض متغیر و متبدل۔ لہٰذا اس جہت سے علوم میں بھی قابلِ توجہ تفاوت پایا جاتا ہے، جیسے قدرت کہ جو عین کمالِ وجودی ہونے کے ساتھ ساتھ مقدورات سے تعلق کے لحاظ سے متفاوت ہوتی ہے کیونکہ مقدورات کے متعدد ایسے مراتب ہیں کہ جو ہرگز ایک دوسرے کے مساوی نہیں ہو سکتے۔

علم اس لحاظ سے کہ کبھی برہان کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی بغیر برہان کے، دو قسموں میں تقسیم ہوتا ہے ایک قسم تحقیقی ہے اور دوسری تقلیدی۔ پہلی قسم اس لحاظ سے کہ مستقل اور قائم بالنفس ہے اور شبہۂ متشککین سے زائل نہیں

ہوتی، دوسری قسم سے کامل تر ہے کہ جو استقلال سے محروم ہے اور معرضِ زوال میں ہے۔ اجتہاد و تقلید میں اہم امتیاز یہی ایک کا استقلال اور دوسرے کی وابستگی ہے۔ اسی طرح درجاتِ علم میں قطع وظن وغیرہ کے اعتبار سے بھی اختلاف موجود ہے۔ یہ موضوع علمِ منطق کے بابِ صناعات خاص سے مختص ہے کہ جس میں مواد اور مبادیِ تصدیقیِ قیاس کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے۔

علم عالم سے بھی تعلق رکھتا ہے اور بعض مراحل میں عین عالم ہے اور علماء روح کی پاکیزگی اور ناپاکی کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں چونکہ بعض تو اسے اپنی اور دوسروں کی ہدایت کے لئے حاصل کرتے ہیں اور بعض اسے زود گزر دنیا کے ٹکڑوں کا وسیلہ قرار دیتے ہیں، نہ خود انھیں اس سے کچھ فائدہ ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو کوئی روشنی بخشتے ہیں اس لحاظ سے علم کی ایک اور تقسیم ناگزیر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:۔

"العلماء رجلان: رجل عالم اٰخذ بعلمه فهذا ناجٍ وعالم تارك لعلمه فهذا هالك ....[1]"

"علماء دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ عالم جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے اور نجات پا جاتا ہے اور دوسرا وہ کہ جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا اور ہلاک ہو جاتا ہے۔"

نفوسِ ناپاک میں موجود علم جہالت کے لشکروں میں سے شمار ہوتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:۔

"من طلب العلم ليباهي به العلماء ويماري به السفهاء او يصرف به وجوه الناس اليه فليتبوّأ مقعده من النار انّ الرئاسة لا تصلح الّا لأهلها"[2]

---

[1] کافی کتاب العلم باب استعمال العلم حدیث ۱۔ [2] کافی باب المستاکل بعلمه والمباهی به حدیث ۶

"جو شخص علم کو علماء کے مقابلے میں فخر کے لئے یا احمقوں سے جدال کے لئے یا لوگوں کی توجہ کے حصول کے لئے حاصل کرتا ہے اس کا ٹھکانا دوزخ ہے کیونکہ سربراہی اس کے اہل ہی کو زیبندہ ہے۔"

اہل وہ ہے کہ جو فکر و عمل ہر دو لحاظ سے مقام شائستہ پر فائز ہو لیکن اگر کسی عالم میں یہ تین خصلتیں ہوں یعنی وہ دامِ فخر میں بھی مبتلا ہو، جدالِ سفہاء کا بھی مرتکب ہو اور بندِ جاہ کا بھی اسیر ہو تو طرح طرح کا عذاب اُس کے انتظار میں ہے۔

اعاذنا اللہ من شرور انفسنا وسیئات اعمالنا۔

(اللہ ہمیں ہمارے نفوس کے شرور سے اور ہمارے اعمال کی برائیوں سے پناہ دے۔)

④ اسلام میں تحصیلِ علم کی ترغیب کمالِ انسانی کے حوالے سے دی گئی ہے جس طرح کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم الا وانّ اللہ یحبّ بغاۃ العلم۔"[1]

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے بیشک اللہ طالب علموں سے محبت کرتا ہے۔"

خود وہ علم کہ جو اہمیت کا حامل ہے اور اس سے غفلت قابل عفو نہیں ہے اور اس سے غفلت پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو ترک کرنے کے برابر ہے، کو بھی کاملاً بیان کیا گیا ہے جس طرح کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

---

[1] کافی باب فرض علم حدیث ۵

"...... انما العلم ثلاثۃ ، آیۃ محکمۃ او فریضۃ عادلۃ اوسنۃ قائمۃ ، وماخلاھنّ فھو فضل ۔"[1]

" علم کی تین قسمیں ہیں آیتِ محکمہ ، فریضۂ عادلہ اور سنتِ قائمہ اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اضافی ہے ۔"

علم مذکور کہ جس کی تحصیل سب پر لازم ہے کی تین قسمیں ہیں :

قسمِ اوّل : الٰہی تصورِ کائنات ثابت کرتا ہے کہ تمام تر قلمروِ ہستی اس ہستِ محض بے نشان کی نشانیوں پر مبنی ہے ۔ یہ تصورِ کائنات شناختِ اسماءِ حسنیٰ ، عرفانِ افعال و آثارِ خدائی ، معرفتِ انبیاء و مرسلین و ائمہ علیہم السلام ، اوراکِ ملائکہ و جنت و جہنم اور قبل از دنیا ، ہمراہِ دنیا اور بعد از دنیا کی شناخت پر محیط ہے یہ تمام تر معرفتیں اصولِ اعتقادی کی طرف لوٹتی ہیں اور اسی پہلی قسم کے تحت آتی ہیں ۔

قسمِ دوم :۔ حکمتِ عملی پر مبنی ہے کہ جس میں فقہ بھی شامل ہے اور حقوق و اخلاق بھی ۔

قسمِ سوم :۔ ان تجرباتی علوم پر مبنی ہے کہ جو محکم سنتِ الٰہی پر استوار ہیں ۔

جو کچھ ان اقسام سے باہر ہوگا وہ واجبات میں سے نہیں بلکہ مسنون ہوگا ۔

اس حدیث کی کئی ایک تفاسیر بیان کی گئی ہیں لیکن وہ علوم جو انسانی معاشرے کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور قوموں کو خصوصا اسلامی اقوام کو استقلال عطا کرتے ہیں مثلاً طب ، صنعت اور زراعت وغیرہ ہرگز زائد نہیں ہیں بلکہ ان کا حصول واجبِ عینی یا کفائی ہے اور ان کے وجوبِ عینی یا کفائی کا حکم دوسری قسم سے اخذ ہوتا ہے اور ان کے حصول کے لئے تیسری قسم میں اشارہ ہے ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمانِ ذیل بھی ان کے حصول کو ناگزیر قرار دیتا ہے :

لایستغنی اھل کلّ بلد عن ثلاثۃ یفرغ الیھم

---

[1] کافی باب صفت علم حدیث ۱

فی امور دنیاھم و اٰخرتھم فان عدموا ثقۃ کانوا ھمجاً، فقیہٍ عالمٍ ورعٍ، و امیرٍ خیّرٍ مطاعٍ، و طبیبٍ بصیرٍ»[1]

کسی بھی بستی کے لوگ ان تین افراد سے بے نیاز نہیں ہو سکتے کہ جو ان دنیاوی اور اخروی ضروریات کو پورا کرتے ہوں۔ اگر ان میں سے قابلِ اعتماد لوگ نہ ہوں تو بستی والوں کی رسوائی ہے۔

ایک فقیہ عالمِ باورع۔

دوسرا ایسا اچھا سربراہ کہ جس کی اطاعت کی جائے۔

تیسرا طبیبِ بابصیرت۔

اگر دفاعی اور طبی صنعتوں جیسے تجرباتی علوم ایک حقیقی تمدن کی خوشحالی اور ترقی میں دخیل نہ ہوتے تو ان کا فقدان رسواکن اور حیوانی زندگی کا باعث نہ بنتا۔ پس اس طرح کے علوم انہی تین علوم کا حصہ ہیں۔ پس علوم کے وہ شعبے کہ جن کا حصول واجب ہے، واضح ہو جاتے ہیں۔

اس مقام پر ضروری ہے کہ اس امر کی طرف توجہ دی جائے کہ اسلام نہ فقط اصلِ علم کا احترام کرتا ہے اور نہ فقط مفید علوم کا تعارف کرواتا ہے بلکہ اس نے ایسے مراکزِ علمی اور دانشگاہیں بھی قائم کی ہیں کہ جو ان علوم کی تدریس کی ذمہ دار ہیں اور انسانی معاشروں کی ان کی طرف راہنمائی بھی کی ہے کہ جس کی طرف بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔

انسان طبیعت کے اعتبار سے ایک وجودِ بے قرار ہے اور مادہ اور مدت کے اعتبار سے منوع[2] اور جزوع[3] ہے صحیفۂ سجادیہ میں ہے: «فانھا (النفوس)

---

[1] تحف العقول ص۳۲۱

[2] منوع۔ "منع" کے مادہ سے ہے، روکنے والا، منع کرنے والا اور بخیل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے

[3] جزوع۔ "جزع" کے مادہ سے ہے، رونے دھونے والے اور مشکلات میں بے تاب ہو جانے والے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (مترجم)

مختارة للباطل الّا ما وفقت، امّارة بالسوء الّا ما رحمت[۱]۔ تاہم جب تک مقہور و مجبور نہ ہو دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی کے لیے تیار نہیں ہوتا لہٰذا یہ جو کہا جاتا ہے کہ انسان مدنی بالطبع ہے اس کے بارے میں تجزیے کی ضرورت ہے کہ آیا بالاصالت مدنی ہے یا بالاضطرار یا کیا اپنی فطرت میں ایسا ہے یا مجبور ہو کر۔ لیکن فطرت کے اعتبار سے انسان حق بین اور حق طلب ہے اور تمدن اپنے حقیقی معنی میں اس کی بنا اور خالص فطرت کے ساتھ ہے، لہٰذا وہ مدنی بالفطرت ہے، اگرچہ اصالتاً مدنی بالطبع نہ ہو۔ فطرت توحیدی کے تقاضے کے تحت مدنی ہونے کا یہ معنی نہیں کہ وہ شہر میں رہتا ہو دیہات میں نہ رہتا ہو کیونکہ مادی انسان اگر شہر میں بھی رہتا ہو تو بھی حقیقی تمدن و حضارت سے محروم ہے جیسا کہ ایک الٰہی انسان دیہات میں بھی رہتا ہو تو بھی فطرت کے خالص تمدن سے بہرہ مند ہے۔ اگر کوئی مفکر فلسفۂ الٰہی، فقہ، اسلامی حقوق اور اسلامی اخلاق کے زیر سایہ تجرباتی علوم حاصل کرے تو اس نے اپنی ندائے فطرت پر ہی لبیک کہی ہے ورنہ اس نے مادی علوم کے ہتھیار سے اس آواز کو خاموش کر دیا ہے اور اس آواز دینے والے کو ہوا و ہوس کے انبار تلے دفنا دیا ہے، قرآن فرماتا ہے:

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (شمس - ۱۰)

(اور نامراد ہوا جس نے اسے خاک میں ملایا۔)

امام سجاد علیہ السلام دانشِ الٰہی کے راہیوں کے لیے یوں دعا فرماتے ہیں:

اللّٰهم واعمم بذلك من شهد بالربوبيّة، و اخلص لك بالوحدانيّة، وعاداه لك بحقيقة العبوديّة، واستظهر بك عليه فى معرفة العلوم

بقیہ حاشیہ[۱]: ترجمہ: نفوس باطل کے اختیار میں ہیں مگر یہ کہ تیری توفیق ہو اور برائی کی طرف دعوت دینے والے ہیں مگر یہ کہ تیری رحمت شامل حال ہو۔
(صحیفۂ سجادیہ دعا ۹)

الرّبانیّۃ۔"[1]

(۳) حقیقتِ اسلام اگر صورتِ عینی میں سامنے آجائے تو وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام جیسے امامِ معصوم کی صورت میں ظاہر ہو گی اور اگر لفظی اور کتبی صورت میں ظہور کرے تو قرآن اور حدیثِ معتبر کے نورانی چہرے کی صورت میں مجسم ہو گی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بارے میں اور اسی طرح امامِ معصوم کے بارے میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ حقیقتِ اسلام کی ہی تعریف کے مانند ہے لہٰذا حدیثِ معروف " انا مدینۃ العلم وعلیٌّ بابہا " متمدن بالفطرت انسانوں کو اس مدینہ" علوم کی طرف دعوت دیتی ہے کہ جس میں جانا ان پر لازم ہے اور اسلام کو الٰہی نظریۂ کائنات، فقہ، حقوق، اخلاق اور سودمند تجرباتی علوم کا گہوارہ قرار دیتی ہے۔ قرآن اور سنتِ معصومین علیہم السلام کے بارے میں کبھی فرمایا گیا ہے:

" انی تارك فیكم الثقلین كتاب الله وعترتی "

(میں تمہارے پاس دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت و آل)۔

اور کبھی فرمایا گیا ہے:

" انا مدینۃ العلم وعلیٌّ بابہا "

کیونکہ " انا " سے مراد ثقلِ اکبر اور قرآنِ کریم ہی ہے اور علیؑ سے مراد فقط امیر المومنین علیہ السلام اور فقط آپ کی ذات نہیں بلکہ یہاں آپ کی شخصیتِ حقوقی کا ذکر ہے یعنی حقیقتِ ولایت و امامت ہے کہ جس کی تجلی تمام معصومین علیہم السلام میں ہے۔

---

[1] ترجمہ:۔ بار الہا اس دعا میں ان لوگوں کو بھی شامل کر جو تیری ربوبیت کی گواہی دیں اور دوئی کے تصور کے بغیر تجھے یکتا سمجھیں اور حقیقتِ عبودیت کی روشنی میں تیری خاطر اس (شیطان) کو دشمن رکھیں اور الٰہی علوم کے سیکھنے میں اس کے برخلاف تجھ سے مدد چاہیں (صحیفۂ سجادیہ دعا ۲۷ ترجمہ مفتی جعفر حسین مرحوم)۔

اس اعتبار سے حدیث کا معنی یہ ہے کہ حقیقتِ اسلام تمام ضروری علوم کا شہر ہے لہٰذا مذکورہ تین علوم کا مدینہ، حوزہ اور دانش گاہ اسلام کی کامل اور جامع حقیقت ہی سے عبارت ہے۔ جیسے چند اصولِ کلی سے ہزاروں فقہی فروعات استنباط کی جاسکتی ہیں اسی طرح چند قواعدِ کلی سے حس و عمل کی مدد کے ساتھ بہت سارے تجرباتی مسائل اخذ کیے جاسکتے ہیں فرق یہ ہے کہ فقہی منابع تجرباتی علوم کے منابع کی نسبت محدود تر ہیں اور ان میں تعقل کی نسبت تعبد زیادہ ہے جبکہ تجرباتی علوم میں تعبد کی نسبت تعقل زیادہ ہے۔ تجرباتی علوم میں تعبد سے مراد وہ وضع کئے گئے اصول اور مفروضے ہیں کہ جو ابھی ثابت نہیں ہوئے۔

اسلامی معاشرہ جس قدر ضروری علوم سے محروم ہوگا اسی قدر احکامِ الٰہی کو عملی صورت دینے سے محروم ہوگا۔ اور پھر ایسے معاشرے کو مدینۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ آپ کا مدینہ، مدینۂ اسلام اور مدینۂ فاضلۂ علم ہی ہے۔ اس امر کی علامت کہ تمام آئمہ علیہم السلام علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی مانند بابِ مدینۃ العلم ہیں، وہ بلند تعبیرات ہیں، جو ان ذواتِ مقدسہ کے بارے میں زیارات وغیرہ میں آئی ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔

"نحن ولاة امر الله وخزنة علم الله وعيبة وحي الله"[1]

ہم امرِ الٰہی کے ولی ہیں، علمِ خدا کا خزانہ ہیں اور وحیِ الٰہی کا مخزن ہیں۔

یہ بھی فرمان ہے:

"الاوصياء هم ابواب الله عزّ وجلّ التي يؤتى منها ولولاهم ما عرف الله عزّ وجلّ وبهم احتجّ الله تبارك وتعالى على خلقه"[2]

---

[1] کافی کتاب الحجۃ باب ان الائمۃ ولاۃ الامر۔

[2] کافی کتاب الحجۃ باب ان الائمۃ خلفاء اللہ فی ارضہ۔

انکے اوصیاء اللہ عزوجل کے وہ ابواب ہیں کہ جن کے ذریعے سے داخل ہوا جاتا ہے اور اگر وہ نہ ہوں تو اللہ عزوجل پہچانا نہ جائے اور انہی کے وجود سے اللہ تبارک وتعالےٰ اپنی مخلوق پر حجت تمام کرتا ہے۔

④ نسلِ انسانی کے حیران کن حد تک بڑھ جانے کی وجہ سے بے شمار افکار پیدا ہوئے ہیں اور بہت سے علوم سامنے آئے ہیں ان سب کا حصول نہ فقط کسی ایک فرد یا کسی ایک خاص گروہ کے بس کی بات نہیں بلکہ بہت سارے گروہ مل جائیں اور ان کے پاس ضروری وسائل بھی ہوں تو بھی آسان نہیں۔ اسی وجہ سے حکمتِ نظری یعنی فلسفہ وکلام وغیرہ اور حکمتِ عملی یعنی فقہ، اخلاق اور ان کے مقدماتی علوم دینی علمی مراکز کے ذمہ ہیں جبکہ ریاضی، سائنسی علوم اور بعض دیگر عملی علوم یونیورسٹیوں کے ذمہ ہیں۔ بعض اوقات ہر دو مراکز میں کوئی فرد یا ایسا ادارہ سامنے آتا ہے کہ جو دوسرے مرکز کے علوم کا بھی حامل ہوتا ہے۔ قم کا مقدس حوزہ انقلابِ اسلامی کی کامیابی کے بعد سے پہلے کی نسبت وسیع سطح پر اپنی ذمہ داری ادا کر رہا ہے اور فقہ واصول کی تالیف وتدریس کے علاوہ علوم قرآن کی تدریس اور ترتیبی اور موضوعی لحاظ سے تفسیرِ قرآن کی تالیف وتدریس نیز اصولِ عقائد، رجال، درایت، نہج البلاغہ اور اقتصاد وغیرہ کی تدریس میں بھی مشغول ہے تاکہ علوم اسلامی کے مختلف شعبوں میں تخصص ومہارت (SPECIALISATION) کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔

حوزہ علمیہ قم کی محترم انتظامیہ کے ابتدائی اقدامات کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں تفسیرِ موضوعی کا کچھ حصہ "کرامت در قرآن" کے عنوان سے شائع ہوا اور اب ہر طرح کی تنقید اور ضروری اصلاح کو سامنے رکھتے ہوئے "ولایت در قرآن" کے عنوان سے کتاب حاضر اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ ادارہ "نشرِ فرہنگی رجا" کو ان کتب کے شائع کرنے کی توفیق حاصل ہو رہی ہے۔

⑤ کلمۂ ولایت کبھی ایسے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ اولیاءِ الٰہی کے رتبۂ وجودی کی نشاندہی کرتا ہے اور کبھی یہ اسلامی معاشرے اور امت کے والی اور متولیوں کے

مقامِ اعتباری کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مطالب کا بڑا حصّہ ولایت اولیاء کے بارے میں ہے اور وہ اُمور کہ جو معاشرے کے والیوں کی ولایت سے متعلق ہیں خصوصاً عصرِ غیبت کے حوالے سے انشاء اللہ انھیں ایک اور کتاب میں بیان کیا جائے گا۔

اولیاءِ الٰہی کی ولایت انسان کے ذریعے سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی انسان اسے چھین سکتا ہے کیونکہ یہ کمالِ وجودی ان برتر علل سے وابستہ ہے کہ جن کے ظہور میں آنے سے یہ ولایت ظہور میں آتی ہے اور جن کے اخفا سے یہ ممتنع ہو جاتی ہے۔ جبکہ حکمرانوں اور والیوں کی ولایت اس کے برخلاف خفیف اور کمتر لوگوں کے ذریعے سے وجود میں آجاتی ہے اور اسی طرح سے ختم بھی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کا ظہور و سقوط اعتبار کنندگان سے وابستہ ہے۔

اولیاءِ الٰہی کی ولایت ہی ہمیشہ سالکوں کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ دعاؤں میں اس کے حصول کی ترغیب دی گئی ہے جبکہ اس کے برخلاف سالک لوگ ہمیشہ کوشش کرتے آئے ہیں کہ حکمرانوں کی ولایت کسی دوسرے کے سپرد کر دیں اور خود حقیقی چیز کی طرف متوجہ رہیں۔ نہج البلاغہ میں ہے:

"من فوت ولایتکم التی انما ھی متاع ایام قلائل یزول منھا ما کان کما یزول السراب"۔[1]

"تمہاری ولایت و حکومت چند دنوں کی ایک ایسی متاع ہے کہ جس کا چلے جانا ایسے ہے جیسے سراب کا زائل ہو جانا"

اگرچہ والیانِ صالح کی ولایت نعمتِ الٰہی ہے جیسا کہ امیر المومنین نے فرمایا ہے:

"فواللہ انی لاولی الناس بالناس"

"اللہ کی قسم میں انسانوں سے خود ان کی نسبت اولیٰ ہوں"[2]

---

[1] نہج البلاغہ خط نمبر ۶۲ [2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۱۷

اور اس کے بغیر معاشرہ ہرج مرج کا شکار ہو جاتا ہے اور ایک عمومی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اولیاء الٰہی ہمیشہ اس مسئلے پر پریشان رہے ہیں جیسا کہ امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:-

"ولکننی اسیٰ ان یلی امر ھذہ الامۃ سفہاؤھا وفجارھا فیتخذوا مال اللہ دولاً وعبادہ خولاً"[۱]

"لیکن میں ڈرتا ہوں کہ اس امت کی باگ ڈور اس کے احمقوں اور فاجروں کے ہاتھ نہ آجائے اور پھر وہ اللہ کے مال کو آپس میں بانٹتے رہیں اور اس کے بندوں کو غلام بنالیں۔"

لیکن چونکہ یہ واجبِ کفائی ہے نہ کہ واجبِ عینی، لہٰذا سبکبارانِ ساحل کو اس کے حصول پر کوئی اصرار نہیں رہا۔ امیر المومنین فرماتے ہیں:

"واللہ ما کانت لی فی الخلافۃ رغبۃ ولا فی الولایۃ اربۃ"[۲]

"نہ مجھے خلافت کا کوئی شوق تھا اور نہ ہی حکومت کی کوئی حاجت۔"

یہ بھی فرمایا ہے:

"دعونی والتمسوا غیری فانا مستقبلون امراً لہ وجوہ والوان"[۳]

"مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کیلئے) میرے علاوہ کوئی اور ڈھونڈ لو۔ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رخ اور کئی رنگ ہیں۔"[۴]

---

[۱] نہج البلاغہ خط نمبر ۶۲ [۲] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۹۶۔ [۳] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۹۰

[۴] متعدد مقامات پر نہج البلاغہ کی عبارتوں کے ترجمے کے لیے مفتی جعفر حسین مرحوم کے ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے (مترجم)۔

جب کہ ولایت اولیاء اس کے برخلاف ایک واجب عینی ہے۔ لہذا دعاؤں کا ایک بہت بڑا حصہ اسی ولایت کی طلب پر مبنی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم جو تعلیم دعا کا سرچشمہ ہے اس میں بہت ساری آیات اسی ولایت کے بارے میں ہیں اور ان میں سے چند ایک کا ذکر ہم اس کتاب میں کریں گے۔

ولایت کے بارے میں بحث کرنا اور اس کو طلب نہ کرنا علم بے عمل ہے اور علم اگر عمل کے بغیر ہو تو کھو جاتا ہے اور اہلیت نہ رکھنے والے مقام سے ہجرت کر جاتا ہے جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"العلم مقرون الی العمل فمن علم عمل وعمل علم والعلم یهتف بالعمل فان اجابة الا ارتحل عنه"[1]

علم، عمل کے ساتھ ساتھ ہے جس نے علم حاصل کیا اس نے عمل کیا اور جس نے عمل کیا علم پایا۔ علم عمل کو دعوت دیتا ہے پس اگر وہ قبول کرے تو یہ باقی رہتا ہے ورنہ یہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔

دعا بھی علم پر عمل کے لیئے راہ ہموار کرتی ہے لہذا اولیاء واصل یعنی انبیاء اور آئمہ معصومین علیہم السلام ہمیشہ دعا کے ذریعے سے ظہور ولاء کا سرمایہ فراہم کرتے تھے اور کوچۂ ولایت کے تمام راہیوں میں ولایت کے آب شیرین کی تشنگی پیدا کرتے تھے اور انہیں حکمرانوں کے آب ولایت سے روکتے تھے کہ جو تکاثر سے زیادہ کچھ نہیں تاکہ کوثر ولایت اولیا ان کے درون و بیرون سے پھوٹے کیونکہ وہی "ہو الظاہر والباطن" کے مظہر ہیں۔ ہاں جب تک وہ تکاثر سے چھٹکارا نہ پائیں کوثر تک نہیں پہنچ سکتے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

"لألقیت حبلها علی غاربها ولسقیت آخرها بکأس اولها ولألفیتم دنیاکم هذه ازهد عندی

---

[1] کافی کتاب فضل العلم باب استعمال۔

من عفطة عنز "[1]

تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اسے اول سیراب کیا تھا اور تم اپنی دنیا کو میری نظروں میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ ناقابلِ اعتنا پاتے۔

کتاب "کرامت در قرآن" کے مقدمے میں جیسے ہم نے اہلِ راز و رمز کی کچھ دعائیں نقل کی تھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مقدمے میں بھی اہلِ سیر و سر کی کچھ دعائیں اور ندائیں ذکر کی جائیں تاکہ علم اور عمل کا کچھ امتزاج ہو جائے اور طلب و دعا کی طراوت خبرِ جامد اور اطلاعِ خشک کی پژمردگی کو دور کر دے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔

" الدّعاء کهف الاجابة کما انّ السّحاب کهف المطر "[2]

" دعا قبولیتِ الٰہی کا مقام ہے جیسے بادل بارش کا ذریعہ ہیں "

جیسے یقینِ محکم اور شوقِ عمل اڑنے کے لیئے دو طاقتور پَر ہیں اسی طرح سے شبہۂ فطری اور شہوتِ عملی راستے کی دو رکاوٹیں ہیں۔ لہٰذا امام سجاد علیہ السلام کہ جو "ھو الداعی" کے مظہر ہیں فرماتے ہیں۔

" و ان هممنا بعمل صالح ثبّطنا عنه یتعرّض لنا بالشّهوات و ینصب لنا بالشّبهات "[3]

جب بھی ہم کسی اچھے کام کا ارادہ کرتے ہیں تو شیطان ہمیں روکتا ہے اور وہ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ شقشقیہ۔

[2] عدۃ الداعی صفحہ ۳۳۔

[3] صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲۵۔

ہمارے راستے میں شبہات اور شہوات کا دام بچھاتا ہے اور یوں راہزنی کرتا ہے۔

طالبانِ ولا کوشش کرتے ہیں کہ ان کا جزم شک و شبہ سے منزہ ہو، عزم کمزوری سے مبرا ہو اور شوق غبارِ شہوت سے پاک ہو کیونکہ

"ان الناقد بصیر"

یقیناً جانچ کرنے والا بصیر ہے۔

"وھب لی الانس بك وباولیائك .... وامنن علیّ بالشوق الیك..."[۱]

مجھے اپنی اور اپنے اولیاء کی محبت عطا فرما .... مجھ پر اپنی جانب کا شوق ارزانی فرما۔

راہیانِ ولا، "بھوک پیاس، شب بیداری، خلوت اور ذکر ودام" کے زرین لمحات کے لئے بے قرار رہتے ہیں لہٰذا رمضان المبارک کے آنے پر جشن مناتے ہیں، امام سجاد علیہ السلام ماہِ مبارک کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"السلام علیك یا شھر الله الاکبر و یا عید اولیائه"[۲]

"اے اللہ کے عظیم مہینے تجھ پر سلام اور اے اولیاء خدا کی عید تجھ پر سلام"

اس مہینے میں چونکہ قرآن نازل ہوا اس لیے اولیاء خدا اس میں زیادہ تر کلام اللہ کی خدمت میں رہتے ہیں اور اس کے اُن اسرار کے طالب ہوتے ہیں کہ جو کو ہماروں کو میسر نہیں، امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"حتیّ توصل الی قلوبنا فھم عجائبه و زواجر امثاله التی ضعفت الجبال الرّواسی علی صلابتھا عن احتماله"[۳]

---

۱ صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۲۱ ۲ صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۴۵ ۳ صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۴۲ ترجمہ مفتی جعفر حسین مرحوم۔

تاکہ اس کے عجائب اور رموز کی حقیقتوں اور اس کی متنبہ کر دینے والی مثالوں کو کہ جنہیں اٹھانے سے پہاڑ اپنے استحکام کے باوجود عاجز آچکے ہیں ہمارے دلوں میں اتار دے۔

سالکانِ کوئے ولا بے قرار ہو کر یوں اللہ کی حمد کرتے ہیں کہ انہیں سعیدانِ اہلِ ولا میں مقام مل جائے۔

"حمدًا نسعد به فی السعداء من اولیائه ونصیر به فی نظم الشهداء بسیوف اعدائه انّه ولیّ حمید"

"ایسی حمد جس کے ذریعے اس کے خوش نصیب دوستوں میں شامل ہو کر خوش نصیب قرار پائیں اور شہیدوں کے زمرے میں شمار ہوں جو اس کے دشمنوں کی تلواروں سے شہید ہوئے۔ بیشک وہی مالک مختار اور قابلِ ستائش ہے"[1]

نیز اولیاءِ الٰہی چونکہ ولاءِ نصر کے بھی حامل ہیں اور منصورِ خدا ہرگز خوار نہ ہوگا لہٰذا وہ یوں زمزمہ سرا ہوتے ہیں۔

"اللّٰهمّ انك من والیت لم یضرره خذلان الخاذلین ومن اعطیت لم ینقصه منع المانعین"

بارالہا جس کی تُو نے مدد کی اسے مدد نہ کرنے والوں کا مدد سے محروم رکھنا کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا اور جسے تو عطا کرے اس کے ہاں روکنے والوں کے روکنے سے کچھ کمی نہیں ہو جاتی[2]

---

[1] صحیفۂ سجادیہ دعاء اوّل ترجمہ مفتی جعفر حسین مرحوم۔

[2] صحیفۂ سجادیہ دعا نمبر ۵ ترجمہ مفتی صاحب۔

اولیاء الٰہی چونکہ ولاء محبت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور اللہ کی محبت تکبر سے ہم آہنگ نہیں۔ بزمِ محبت میں جو کوئی بھی مقرب تر ہے بارگاہِ قدسِ الٰہی میں اس کی خاکساری افزون تر ہے امام سجاد علیہ السلام بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں۔

"وان احب عبادك اليك من ترك الاستكبار عليك وجانب الاصرار ولزم الاستغفار"[1]

یقیناً تمام بندوں میں سے وہ بندہ تجھے زیادہ محبوب ہے جو تیرے مقابلے میں سرکشی نہ کرے، گناہوں پر مصر نہ ہو اور توبہ و استغفار کی پابندی کرے۔

اِس لحاظ سے کہ ولاء شیطان ولاء رحمان کے لیئے رکاوٹ ہے اولیاء الٰہی ہمیشہ گزندِ شیطان سے نجات کی دُعا کرتے ہیں۔

اللّٰهم اجعلنا فی نظم اعدائه واعزلنا عن عداد اولیائه لانطیع له"

اے اللہ ہمیں اس کے دشمنوں میں شمار کر اور اس کے دوستوں میں شمار ہونے سے علیحدہ کر لے تاکہ وہ ہمیں بہکائے تو اس کی اطاعت نہ کریں[2]۔

قیامت میں اولیاء الٰہی چونکہ خوف و ہراس سے محفوظ ہونگے اور بہشت میں ان کا ٹھکانا تزئینِ الٰہی کا حامل ہوگا چونکہ اللہ نے اس بہشت کو اپنے اصفیاء کے لیئے مزین فرمایا ہے لہٰذا ان کے ساتھ حشر و نشر اور بہشت میں ان کی ہمسائگی راہیانِ ولاء کی ایک تمنا ہے۔

"وارحمنی فی حشری ونشری واجعل فی ذلك

---

[1] صحیفۂ سجادیہ دعا نمبر ۱۲ ترجمہ مفتی جعفر حسین مرحوم۔

[2] صحیفۂ سجادیہ دعا نمبر ۱۷ ترجمہ مفتی جعفر حسین مرحوم۔

الیوم مع اولیاءك موقفی"

اے میرے مولا! حشر و نشر کے ہنگام مجھ پر رحم کرنا اور اس دن میرا قیام اپنے دوستوں کے ساتھ قرار دینا[1]

"وجاورنی الأطیبین من اولیائك فی الجنان التی زینتها لأصفیائك"

اور جنت میں جسے تو نے اپنے برگزیدہ بندوں کے لیئے سجایا ہے، مجھے اپنے پاکیزہ دوستوں کا ہمسایہ قرار دے[2]

نیز اس اعتبار سے اولیاء الٰہی کے حضور رسوائی زیادہ ذلت کا باعث ہے لہٰذا اللہ سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اس سے نجات عطا فرمائے۔

ولا تخزنی یوم تبعثنی للقائك ولا تفضحنی بین یدی اولیائك۔

اور جس دن مجھے اپنی ملاقات کے لئے اٹھائے مجھے ذلیل و خوار اور اپنے دوستوں کے سامنے رسوا نہ کرنا[3]

اولیاء الٰہی چونکہ قرب خاص کے حامل ہیں لہٰذا ان کی محبت اور ان کی محفل میں شرکت ان کے راستے کے راہیوں کی مطلوب رہی ہے۔

"واجعلنی فیه من اولیائك المقربین"

اور مجھے اس دن اپنے مقرب اولیاء میں سے قرار دے[4]

"اللّٰهم اجعلنی فیه محبًّا لأولیائك ومعادیًا لأعدائك"

---

[1] صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۵۳ ترجمہ مفتی صاحب مرحوم۔

[2] صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۴۷ ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحب مرحوم۔

[3] صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۴۷ " " " " "

[4] مفاتیح الجنان، ماہ رمضان کے پانچویں دن کی دعا۔

بارالٰہا! اس دن مجھے اپنے اولیاء سے محبت اور اپنے اعدأ سے دشمنی کرنے والا قرار دے[1]

اہلِ ولا کے لیئے چونکہ افزائشِ محبت کی فضا سازگار ہے اور ان میں سے بعض کے دِل میں یہ تمنا ہے کہ حق تعالٰے سے ان کی محبت بڑھ جائے لہٰذا مشتاقانِ کوچۂ ولایت یوں کہتے ہیں :-

"الٰھی اقمنی فی اھل ولایتك مقام من رجا الزیادة من محبتك"

الٰہی! مجھے اپنی ولایت کا وہ مقام عطا فرما جس میں تیری محبت کی امید زیادہ ہو[2]

اس لحاظ سے کہ اولیاء الٰہی کا واضح ترین مصداق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیتِ عصمت وطہارت علیہم السلام ہیں لہٰذا ان سے الحاق کی دُعا کی جاتی ہے :-

"والحقنی باولیائك الصالحین محمد وآله الابرار الطیبین الطاهرین الاخیار صلواتك علیهم وعلی اجسادهم واراواحهم ورحمة الله وبرکاته"

اور مجھے ملحق کردے اپنے صالح اولیاء محمدؐ اور ان کی نیک پاک طاہر اور اہلِ خیر آل کے ساتھ، تیرا درود ہو ان پر، ان کے جسموں پر اور ان کی روحوں پر، اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں ان پر[3]

اولیاء الٰہی چونکہ ولایتِ حق کے ذریعے عزیز ہیں اور اس اعتبار سے عزتِ خاص کے حامل ہیں لہٰذا یوں زمزمہ سرا ہوتے ہیں۔

"یامن خص نفسه بالسمو والرفعة فاولیاؤه بعزه یعتزون"

---

[1] مفاتیح الجنان ماہِ رمضان کے پچیسویں دن کی دُعا۔

[2] " " مناجاتِ شعبانیہ

[3] مفاتیح الجنان دعاء ابوحمزہ ثمالی

اے وہ کہ جس نے اپنے نفس کو بلندی و رفعت سے مختص کر لیا ہے پس
اس کے اولیاء اس کی عزت سے عزت پاتے ہیں [1]
جیسا کہ اللہ کی ہیبت وجلال کا جامہ بھی زیب تن کئے ہوتے ہیں۔

"ویامن البس اولیاءہ ملابس ہیبتہ فقاموا بین یدیہ مستغفرین"

اے وہ کہ جس نے اپنے اولیاء کو لباسِ ہیبت اس طرح سے پہنا دیا ہے کہ وہ اُس کے حضور حالتِ استغفار میں کھڑے ہیں [2]

خلاصہ یہ کہ اولیاء الٰہی کی ولا کی طلب کی علامتیں دعاؤں اور اذکار میں بہت زیادہ ہیں مناجات میں اللہ کو زیادہ تر لفظِ "مولیٰ" سے پکارا گیا ہے یہ اس امر کی دلیل ہے کہ معلمانِ نفوس نے طریقِ ولایت کو طے کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔

(۶) اب جب کہ کوچۂ ولا کے سالکوں کا اسلوبِ دعا اجمالی طور پر واضح ہو گیا ہے تو کوچۂ ولایت تک جا پہنچنے والوں نے جو کچھ پایا ہے اسے بھی معلوم ہونا چاہیئے۔ سلوک جس درجہ کا ہوگا وصول اسی کی مناسبت سے ہوگا۔ اگر نہایت کمال تک جا پہنچے گا تو وصولِ کامل اس کے ہمراہ ہوگا جیسے کہ کوچۂ ولا کے اہلِ سلوک کے لیے بہترین زمزمہ اس راستے کے قافلہ سالاروں یعنی معصومین علیہم السلام کی دعائیں ہیں اسی طرح اس کوچے کے واصلانِ نسبی کے لیئے بہترین نجوا و نوا بھی اس منزل کے واصلانِ کامل یعنی معصومین علیہم السلام ہی کی مناجات ہیں۔

ولایت تک رسائی توحیدِ ذات وصفات وافعال کا شہود ہی ہے اس کے باوجود کسی کمالِ ہستی کی نسبت غیرِ خدا کی طرف نہیں دی جاسکتی بلکہ سب کمالاتِ ہستی

---

[1] مفاتیح الجنان دعاء عرفہ سید الشہداء ع

[2] مفاتیح الجنان دعاء عرفہ سید الشہداء ع

کی نسبت صرف اور صرف ذاتِ اقدسِ الٰہی سے دی جا سکتی ہے۔ حالِ سلوک میں جن کمالات کی ضرورت ہوتی ہے اور جو حالِ وصول میں سلب ہو جاتے ہیں اور یہ سلب ہر اثبات سے بہتر ہے اس کے کچھ نمونے ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱) ان کمالاتِ ہستی میں سے ایک علم ہے اور ہر سالک کو اس کی ضرورت ہے۔ لیکن جب وہ واصل ہو جائے تو وہ دیکھتا ہے کہ تمام علوم حق تعالےٰ کے لا محدود علم میں فانی ہیں اور وہ دیکھتا ہے کہ اس تک نہ اس کی کوئی پہنچ ہے اور نہ دوسرں کی، اگرچہ سید اولیاء حضرت امیر المؤمنین فرماتے ہیں۔

"ینحدر عنی السیل ولا یرقی الی الطیر"

"سیلابِ علم میری روح کی چوٹیوں کو چھوتا ہے اور کوئی پرندہ میری بلندیوں پر پر نہیں مار سکتا"۔[۱]

نیز فرماتے ہیں:۔

"سلونی قبل ان تفقدونی فلانا بطرق السماء اعلم منی بطرق الارض"

پوچھو مجھ سے اس سے پہلے کہ میں تم سے جدا ہو جاؤں یقیناً میں آسمانِ غیب کے راستوں کو زمینِ شہادت کے راہوں سے بہتر جانتا ہوں[۲]

آپ کے اس دعوے کی تصدیق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی ہے اور یوں گواہی دی ہے:

"یا علی اعطیت جوامع الکلم واوتیت جوامع الحلم۔

اے علیؑ! مجھے کلام کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں اور تجھے علم کی چابیاں دی گئی ہیں[۳]

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۳ (شقشقیہ)

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۱

[۳] خصال باب ۵ حدیث ۵۷

اس کے باوجود علی علیہ السلام ذاتِ اقدس الٰہی کے حضور اپنی واصلانہ دعا میں عرض کرتے ہیں :۔

"وعد علیّ بفضلك علی مذنب قد غمرہ جھلہ"

(اور مجھ جیسے پر اپنے فضل وکرم سے ترحم فرما کہ جو اپنی جہالت و نادانی سے گناہوں کی دلدل میں پھنس گیا ہے)[1]

جیسا کہ ہم سب ماہِ مبارک رمضان کی دعاءِ افتتاح میں عرض کرتے ہیں "فارحم عبدك الجاھل" (اپنے جاہل بندے پر رحم فرما) کیونکہ حق تعالیٰ کے ذاتی اور بے کراں علم کے مقابلے میں صاحبِ مقام "سلونی" اور دوسرے یکساں ہیں۔

② کمالاتِ وجودی میں سے ایک قدرت بھی ہے۔ کوچۂ ولایت کے ہر راہی کو اس کی ضرورت ہے لیکن جب واصل ہو جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ تمام قدرتیں اور طاقتیں حق تعالےٰ کے بے کراں اقتدار کے سامنے فانی ہیں اور وہ دیکھتا ہے کہ نہ اس کے پلے کچھ ہے اور نہ کسی اور کے پاس۔ اگرچہ سید الاولیاء حضرت علیؑ ابنِ ابی طالب فرماتے ہیں :۔

"واللہ لو تظاھرت العرب علی قتالی لما ولّیت عنھا"

اللہ کی قسم اگر سارے عرب میرے قتل کے لئے جمع ہو جائیں تو بھی میں ان کی طرف پشت نہیں کروں گا[2]

نیز یہ بھی فرمایا :۔

"واللہ ما قلعت باب خیبر و رمیت بہ خلف ظھری اربعین ذراعا بقوۃ جسدیۃ ولا حرکۃ غذائیۃ لکنی

---

[1] مفاتیح الجنان مناجات شعبانیہ

[2] نہج البلاغہ نامہ ۴۵

ایدت ملکوتیۃ و نفس بنور ربّھا مضیئۃ"

اللہ کی قسم بابِ خیبر کو قوتِ مادی سے نہیں اکھاڑا تھا بلکہ طاقتِ ملکوتی اور نورِ پروردگار سے روشن نفس سے اکھاڑ پھینکا تھا۔[1]

اس کے باوجود اپنے زمزمۂ واصلانہ میں ساحتِ قدسِ حق کے حضور عرض کرتے ہیں:

"ربّ ارحم ضعف بدنی و دقّۃ جلدی ودقّۃ عظمی"

"اے میرے پروردگار میرے بدن کے ضعف، میری جلد کی نرمی اور میری ہڈیوں کی کمزوری پر رحم کر"[2]

اور اگرچہ آپ "لا فتیٰ الّا علی۔ لا سیف الّا ذوالفقار" کے بلند مقام پر فائز ہیں اس کے باوجود یوں گریہ وزاری کرتے ہیں۔

"ارحم من راس مالہ الرجاو سلاحہ البکاء"

پروردگار اس پر رحم فرما کہ جس کا سرمایہ امید اور جس کا ہتھیار بکا ہے۔[3]

(۴) حریت بھی روح کے کمالاتِ وجودی میں سے ایک ہے اور ہر طالب ولا اس کا نیازمند ہے لیکن جب کوئی سالک واصل ہو جاتا ہے تو وہ ہر طرح کی حریت کو حق تعالےٰ کی ہستیِ مطلق میں فنا پاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ اور دوسرے تو اس سے تہی دامن ہیں اگرچہ سید الاولیاء حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان قوما عبدوا اللہ رغبۃ فتلک عبادۃ التجّار و انّ قومًا عبدوا اللہ رھبۃ فتلک

---

[1] امالی صدوق مجلس ۷۷
[2] مفاتیح الجنان دعاء کمیل۔
[3] مفاتیح الجنان دعاء کمیل

عبادۃ العبید، ان قوماً عبدوا اللہ شکراً فتلك عبادۃ الاحرار"

ایک جماعت نے اللہ کی عبادت ثواب کی رغبت وخواہش کے پیش نظر کی۔ یہ سوداگرنے والوں کی عبادت ہے اور ایک جماعت نے خوف کی وجہ سے کی یہ عبادت غلاموں کی عبادت ہے۔ اور ایک جماعت نے از روئے شکر وسپاس عبادت کی یہ آزادوں کی عبادت ہے [1]

جب کہ آپ سے ایک حدیثِ مرسل یوں مروی ہے:

"الٰھی ما عبدتك خوفاً من نارك ولا طمعاً من جنتك بل وجدتك اھلاً للعبادۃ فعبدتك"

الٰہی میں نے تیری عبادت تیری آگ کے خوف سے نہیں کی ہے اور نہ ہی تیری جنت کے لالچ میں، بلکہ میں نے تیری عبادت تجھے عبادت کا اہل پاکر کی ہے [2]

اگرچہ اس مضمون کی کوئی حدیث احادیث کے جوامع میں نہ بھی ہو پھر بھی اس کے مضمون کی درستی میں کوئی شک نہیں۔ کیونکہ اس شخص کی عبادت سے بڑھ کر کسی کی عبادت نہیں ہوسکتی کہ جس کی جنگِ خندق کے روز ضربت تاریخ ساز سب عبادتوں اور سب کی عبادتوں سے روزِ قیامت تک افضل ہو۔ اس کی عبادت نہ فقط احرار کی عبادت ہے بلکہ ان کی بھی بہترین عبادت، اس کے باوجود وہ بارگاہِ الٰہی میں اس طرح سے فریاد واصلانہ کرتے ہیں۔

" وفُکّنی من شدّ وثاقی " [3]

---

[1] نہج البلاغہ کلماتِ قصار نمبر ۲۲۹۔

[2] العروۃ الوثقیٰ باب النیۃ۔

پروردگارا! مجھے اس مضبوط رسی سے آزاد فرما۔
اگرچہ وہ جہنم کے خوف سے بھی آزاد تھے اور بہشت کے شوق سے بھی۔
مختصر یہ کہ کسی کمالِ ہستی کا اس ہستِ محض کے مقابل کوئی ظہور نہیں ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر کمال صرف اسی کا وصفِ کمالی ہے کہ جو جامِ روحِ اولیاء میں ظاہر ہوتا ہے۔ حالتِ حجاب اور حالتِ شہرت میں دراصل فرق ظہورِ کمالِ حق کا نہیں بلکہ فرق اس ظہور کے علم اور اس ظہور کے جہل میں ہے اور ہر وہ علم کہ جو اس خاص آگاہی کی راہ ہموار نہ کرے حجاب ہے۔

اب تک سالکان و واصلان کی دعاؤں کے زمزموں میں ان کے راہِ توشہ وحصول کا کچھ نمونہ ذکر ہوا اور جو بیان کرنا مقصود ہے وہ عبد و مولا کے درمیان راہِ وصول ہی ہے۔ بندہ کس راستے سے واصلِ حق ہوتا ہے اور اس کی حفاظت کیونکر ممکن ہے؟

اللہ سبحانہ چونکہ ہستی نامحدود ہے لہٰذا ہر چیز خود اپنے آپ کی نسبت بھی خدا سے نزدیک تر ہے اس لیے ایک ہی راہِ وصول رہ جاتی ہے اور وہ اس کا شہود ہے اور ایک ہی حجاب ہے اور وہ ہے اس کے غیر کو دیکھنا اور حجاب کو دور کرنے کا ایک ہی چارہ ہے اور وہ ہے اس کی طرف ایسا انقطاع کہ ادراکِ حصولی کے لحاظ سے ہر حسی، خیالی، وہمی اور عقلی چیز اور اسی طرح علمِ حضوری کے اعتبار سے بینشِ شہودی میں آنے والی ہر چیز وجہ اللہ کی حیثیت سے ہو۔

"فاینما تولّوا فثمّ وجہ اللہ"

پس تم جس طرف بھی منہ کرو گے تو اللہ کو موجود پاؤ گے[1]

"جب سالک بصیرت کے لحاظ سے ایسے مقام تک پہنچ جائے کہ اپنی اور دوسروں

---

[1] البقرۃ: ۱۱۵

کی تمام تر ہستی کو اس بے نشان کی نشانی پائے تو پھر وہ اپنے افکار پر بھی مسلط ہو جاتا ہے کہ برا سوچتا ہے نہ برا چاہتا ہے اور اسی طرح ہوش اور وسوسے سے پیدا ہونے والی خواہشات پر پردۂ نسیان ڈال دیتا ہے اور محو کر دیتا ہے نیز اپنی رفتار و گفتار پر بھی اس طرح سے قابو پا لیتا ہے کہ رضائے حق کے خلاف قدم نہیں اٹھاتا۔

جب سالک شہودِ حق کے اعتبار سے شرک آلود فکر و نظر، فکر و بینش اور روش و کردار سے نجات پا لیتا ہے تو اس ذاتِ محیطِ صرف کا مشاہدہ کرتا ہے کہ جس کا جمال اس کے جلال میں ملا ہوا ہے اور جس کا قہر اس کے لطف و مہر میں رچا بسا ہے کمالاتِ ہستی کو اس کی مِلکِ مطلق سمجھتا ہے اور جہانِ غیب و شہود کو سرتا پا اسی کے جمال کا آئینہ دار پاتا ہے اور آئینے کی طرف تھوڑی سی توجہ بھی آئینے کے اندر کی صورت کے لیے ایک حجاب سمجھتا ہے۔ اور چھوٹی سی خواہش کو بھی آئینے کی صاف و شفاف سطح پر غبار تصور کرتا ہے اور وہی حالت جو دوسروں کے لیے طبیعی موت کے بعد پیش آتی ہے وہ ابھی اپنی ارادی موت کے ذریعے اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

«لمن الملك اليوم لله الواحد القهار»

آج ملک و حکومت کس کی ہے اللہ واحدِ قہار کی ہے

«يوم لا يملك نفس لنفس شيئاً والامر يومئذ لله»

اس روز کسی نفس کو کسی دوسرے کے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہوگا اور اس دن حکم اللہ ہی کا ہوگا۔ ؎

ایسا نہیں ہے کہ آج امورِ عالم دوسروں کے ہاتھ میں ہیں اور اس روز اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے بلکہ تمام ایام اور تمام ادوار میں ذرہ ذرہ پر خدا ہی کی حکمرانی ہے۔ عام لوگ قیامت کے بعد جس شہود کے مقام پر پہنچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ درحقیقت

وہ کمالِ ابدی کے طالب تھے اور کمالِ ابد خدا کے سوا کسی سے میسر نہیں ہے جب کہ سالکِ واصل اس سب کچھ سے اپنی ارادی موت کے ذریعے سے آگاہ ہے اور اس کا حامل ہے۔ وہ چونکہ اس حال کے ثمرۂ خوشگوار کو جانتا ہے اس لیے وہ غیرِ حق کو نہ دیکھنے کے مقام کے حصول کے لئے جہادِ اصغر و اکبر کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس مقام کی حفاظت کے لیے نیز دونوں جہادوں سے اپنے ثمرہ کے حصول کے لیے غفلت نہیں کرتا کہ غفلت شہودِ حق سے حجاب ہی ہے وگرنہ ۔

جمالِ یار ندارد نقاب و پردہ دلی
غبارِ رہ بنشان تا نظر توانی کرد

یعنی۔ جمالِ یار ترے پردہ و نقاب نہیں
غبارِ رہ کو ہٹاؤ تو کچھ دکھائی دے

اب ہم سالکانِ واصل میں سے بہترین کی زبانی بات سنتے ہیں۔ مناجاتِ شعبانیہ جو تمام آئمہ معصومین علیہم السلام کا دستور العمل ہے عبد کی طرف سے پہلے دعا پھر ندا اور بعد میں نجوا پر مشتمل ہے اور مولی کی ندا اور نجوا پر تمام ہوتی ہے۔

" واسمع دعائی اذا دعوتك واسمع ندائی اذا ناديتك واقبل علیّ اذا ناجيتك ..... واجعلنی ممن ناديته فاجابك ولاحظته فصعق لجلالك فناجيته سرًّا وعمل لك جهرًا "

"جب میں پکاروں تو تو میری دعا سن اور جب میں ندا دوں تو تو میری ندا سن اور جب میں تیرے حضور نجوا کروں تو تو قبول کر..... اور مجھے ولیا قرار دے کہ جسے تو نے پکارا تو اس نے تیری دعوت پہ لبیک کہا اور جب تو اس کیلئے متوجہ ہوا تو تیرے جلال و عظمت کی تاب نہ لاتے ہوئے مدہوش ہو گیا پس تو نے باطن میں اس سے راز گوئی کی اور وہ آشکارا تیرے لیے اعمال بجا لاتا ہے" (حاشیہ صفحہ آئندہ)

ائمہ علیہم السلام نے اس مناجات میں جس چیز کی آرزو کی ہے وہ اس چیز سے بالاتر ہے کہ جو موسیٰ کلیم اللہ کو حاصل ہوئی۔ کیونکہ کلیم اللہ کی مدہوشی اور بے ہوشی حق تعالےٰ کی نگاہِ غیرِ مستقیم کا نتیجہ تھی کیونکہ خدا سبحان کی نگاہ پہاڑ پر پڑی نہ کہ موسیٰ پہ جیساکہ قرآن میں ہے:

"فلمّا تجلّیٰ ربّہ للجبل"

اللہ نے موسیٰ کی خواہش کا جواب پردۂ حجاب دیا نہ کہ بے پردہ۔ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے عرض کی:

"ربّ ارنی انظر الیک"

مراد یہ ہے کہ: میرے رب! اپنے آپ کو مجھے دکھا اور میرے لیے تجلی کر تاکہ میں تجھے سر کی آنکھوں سے نہیں بلکہ روح کی آنکھوں سے نظر کرسکوں بلا واسطہ دیکھنے کا تقاضا ہرگز نہیں کیا بلکہ بے پردہ نظر کرنے کی تمنا کی اور نظر کرنے اور دیکھنے میں بہت فرق ہے خود خدا نے فرمایا کہ بے پردہ رویتِ حق تیرے نصیب میں نہیں اور تجلیٔ بے حجاب بھی تیرے نصیب میں نہیں ہوگی بلکہ جس طرح کلامِ حق سننے کے لئے حجاب درخت وخیل تھا جمالِ حق کے شہود کے لیے بھی پردۂ کوہ وخیل ہوگا کوہ پر اس جلال آمیز تجلی کا ثمرۂ شجر اس جمال آمیز تجلی سے مختلف تھا کیونکہ اس میں تو نہ فقط کوئی سنگینی نہ تھی بلکہ اس نے حضرتِ موسیٰ کے ہر طرح کے ہراس واضطراب کو دور کر دیا۔

اس موقع پر پہاڑ یوں ریزہ ریزہ ہوا کہ اس کا کچھ باقی نہ رہ گیا کیونکہ تجلیٔ مستقیم کی صورت میں کسی غیر کا ظہور نہیں رہتا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے اور جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے حق تعالےٰ کے "سبوح" ہونے کا ذکر کیا کہ ہر انسانِ کامل واسطۂ حق کے بغیر شہود کی طاقت نہیں رکھتا۔

حاشیہ تقیہ ہٰذا مفاتیح الجنان مناجات شعبانیہ۔

"ولمّا جاء موسٰی لمیقاتنا و کلّمہ ربّہ قال ربّ ارنی انظر الیک قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقرّ مکانہ فسوف ترانی فلمّا تجلّی ربّہ للجبل جعلہ دکًّا وخرّ موسٰی صعقًا فلمّا افاق قال سبحانک تبت الیک و انا اوّل المؤمنین"

اور جب موسیٰؑ ہماری مقرر کردہ جائے وعدہ پر آیا اور اس کا پروردگار اس سے ہم کلام ہوا تو اس (موسیٰؑ) نے کہا اے میرے پروردگار مجھے اپنے جلوے کی جھلک دکھا دے۔ اس (اللہ) نے کہا تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا لیکن پہاڑ کی جانب دیکھ۔ پس اگر وہ اپنے مقام ہی پر قائم رہے تو تو مجھے دیکھ لے گا۔ پس جب اس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑا پس جب ہوش آیا تو کہا تو منزہ ہے میں تیرے حضور پلٹتا ہوں اور میں اوّل ایمان لانے والا ہوں [1]۔

لہٰذا کلیم اللہ کو جو کچھ حاصل ہوا وہ تجلّی باحجاب کے نتیجے میں مدہوشی تھی لیکن اس مناجاتِ شعبانیہ میں مطلوب ایسی مدہوشی ہے کہ جو بے حجاب تجلّی مستقیم کا نتیجہ ہو کیونکہ اس میں خواہش کی گئی ہے کہ "ولاحظتہ فصعق لجلالک" نہ "لاحظت شیئًا آخر" اور اس فرق کا راز ماقبل کے جملوں میں پایا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں خداء سبحان سے کمال الانقطاع کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

"الٰھی ھب لی کمال الانقطاع الیک وانر ابصار قلوبنا بضیاء نظرھا الیک حتّٰی تخرق ابصار القلوب حجب النور فتصل الی معدن العظمۃ وتصیر ارواحنا

---

[1] الاعراف ۱۴۳

معلقۃ بعزّ قدسک"

بارالہا! مجھے اپنی طرف انقطاعِ کامل عطا فرما اور دل کی آنکھوں کو اپنے نور کے مشاہدے سے اس طرح منور فرما کہ ہماری بصیرت نورانی حجاب اور پردوں کو چاک کر کے تیرے منبعِ عظمت تک پہنچ جائے اور ہماری روحیں تیری عزت کے مقدس مقام سے وابستہ ہو جائیں۔

اگر ایک سالک ہر تعلق بلکہ ہر تعین سے منقطع اور آزاد ہو جائے تو جیسے کوئی موجودِ مادی اس کے لیے حجابِ ظلمت نہیں بنے گا کوئی موجودِ مجرد بھی اس کے لیے حجابِ نور نہیں بنے گا اور نہ ہی کسی مطلبِ علمی کی صعوبت اس کے لیے نفوذِ شہود میں رکاوٹ بنے گی کیونکہ وہ ہر طرح کی دوسری علت کی احتیاج سے نجات پا کر فقط علتِ فاعلیت سے وابستہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا ظرفیتِ محدود اور قابلیتِ مقید کی بات ہی ختم ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس نے فقط عزِّ قدسِ الٰہی پر تکیہ کر لیا ہے اور یہ وہ مقام ہے کہ جو سب تجلیوں کا حامل ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مقام معدنِ عظمت سے عبارت ہے مذکورہ بالا مناجات کے آخر میں آیا ہے۔

" والحقنی بنور عزّك الأبهج فاكون لك عارفاً وعن سواك منحرفاً "

اور مجھے اپنے مقامِ عزت کے نور سے کہ جس کا لذت و سرور ہر لذت و سرور سے بالاتر ہے ملحق فرما تاکہ تیرا عارف بن جاؤں اور تیرے غیر سے منہ موڑ لوں۔

یہ بات کمالِ انقطاع سے ہم آہنگ ہے اور یہ جو آیا ہے "ومن کے خائفاً مراقبا" اس سے مراد خوفِ ہجراں ہے، وہ ہجر کہ جو امر باعثِ بے ہوشی کو ملاحظہ کرنے سے لاحق ہوتا۔ یہاں خوفِ دوزخ مراد نہیں کہ جو ان ذواتِ مقدسہ کے ابتدائی کمالات سے متعلق ہوتا ہے جہنم کا دائمی خوف اور دیگر کمالاتِ انسانی کا ذکر دعاؤں میں موجود ہے لیکن مناجات کے اس جملے میں جس خوف کا ذکر ہے

وہ مقام قربِ شہود کے کھو جانے کا خوف ہے:

"ھبنی صبرت علیٰ عذابك فکیف اصبر علی فراقك
و ھبنی صبرت علی حرّ نارك فکیف اصبر عن
النظر الیٰ کرامتك"

مجھے بخش دے اگر میں نے تیرے عذاب پر صبر بھی کر لیا تو بھی تیرے فراق پر کیسے صبر کروں گا اور اگر تیری آگ کی تپش پر بھی صبر کیا تو تیرے کرم سے چشم پوشی پر کیسے صبر کروں گا۔[1]

لہٰذا معلوم ہوا مولیٰ سے عبد کے وصال کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ راہِ شہود ہے۔ سید الاولیاء امام علی علیہ السلام وصولِ ملائکہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"و وصلت حقائق الایمان بینھم (الملائکۃ) و
بین معرفتہ تعالیٰ و قطعھم الایقان بہ الی
الوَلہ الیہ و لم تجاوز رغباتھم ما عندہ الی ما
عند غیرہ فذاقوا حلاوۃ معرفتہ تعالیٰ و شربوا
بالکأس الرّویّۃ من محبّتہ و تمکّنت من سویداء
قلوبھم و شیجۃ خیفتہ"

اور ایمان کے ٹھوس عقیدے ان (فرشتوں) کے لیے اللہ کی معرفت کا وسیلہ بن گئے اور یقینِ کامل نے اوروں سے ہٹا کر اسی سے ان کی لو لگا دی۔ اللہ کی طرف سے نعمتوں کے سوا کسی غیر کے عطاء انعام کی انہیں خواہش ہی نہیں ہوتی۔ انہوں نے معرفت کے شیریں مزے چکھے ہیں اور محبت کے سیراب کرنے والے جام سے سرشار ہیں اور ان

---

[1] مفاتیح الجنان دعاء کمیل۔

کے دلوں کی تہہ میں اس کا خوف جڑ پکڑ چکا ہے۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۸۹ ترجمہ مفتی صاحب مرحوم)

ملائکہ اور معرفتِ خدا کے درمیان جو چیز رابطہ قرار پائی وہ ایمانِ حقیقی کا راستہ ہی ہے۔ وہ اللہ پر یقین کے نتیجے میں حضرتِ حق کے والا و شیدا ہو گئے اور غیرِ خدا کی طرف انہیں ہرگز رغبت نہ ہوئی جس قدر انہوں نے معرفتِ حق کا مزا چکھا اسی قدر محبت کا جامِ لبریز ان کو نصیب ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی جان کی اتھاہ گہرائیوں میں خوفِ الٰہی جاگزیں ہو گیا۔

کمال الانقطاع کے بہت سے ثمرات ہیں کہ جن میں سے ایک کا ذکر امام سجاد علیہ السلام کی دعا میں یوں کیا گیا ہے:

"اللّٰھم انی اخلصت بانقطاعی الیک و اقبلت بکلّی علیک وصرفت عمن یحتاج الی رفدک و قلبت مسألتی عمن لم یستغن عن فضلک و رأیت انّ طلب المحتاج الی المحتاج سفه من رأیه و ضلّة من عقله"۔

اے اللہ! میں پورے خلوص کے ساتھ دوسروں سے منہ موڑ کر تجھ سے لو لگائے ہوں اور ہمہ تن تیری طرف متوجہ ہوں اور اس شخص سے جو تیری عطا و بخشش کا محتاج ہے منہ پھیر لیا ہے اور اس شخص سے جو تیرے فضل و احسان سے بے نیاز نہیں ہے سوال کا رخ موڑ لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ محتاج کا محتاج سے مانگنا سراسر سمجھ بوجھ کی کمی اور عقل کی گمراہی ہے[1]

---

[1] صحیفۂ سجادیہ دعا ۲۸ ترجمہ مفتی صاحب۔

ایک اور دعا میں کہتے ہیں :

"وقلت سبحان ربي كيف يسأل محتاج محتاجًا وانى يرغب معدم الى معدم"

اور میں نے کہا واہ سبحان اللہ! کس طرح ایک محتاج دوسرے محتاج سے سوال کرتا ہے اور کہاں ایک نادار دوسرے نادار سے رجوع کرتا ہے[1]۔

مختصر یہ کہ اللہ کی طرف کمالِ انقطاع کا نتیجہ یہ ہے کہ سالک کو اس کے غنائے مطلق اور دوسروں کے فقرِ محض کا شہود حاصل ہوتا ہے اس حالت میں غیرِ خدا سے طلب کرنا حماقت و گمراہی ہے اور کسی تہی دست کی دوسرے تہی دست کی طرف رغبت تعجب انگیز ہے۔ خدایا! تیرے سوا اور تجھ سے سوا نہ ہمارا ہدف ہے نہ ہماری راہ۔ تو ہمیں خود ہی اپنی راہ سے اپنے تک پہنچا۔

"يا نعيمي وجنتي يا دنياى وآخرتي ويا ارحم الراحمين"

العبد، عبداللہ جوادی آملی

۲۵، رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

قم مقدس

---

[1] صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۱۳ ترجمہ مفتی صاحب

درس ۱

"اعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم. بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم"
"الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا
اللہ وصلّی اللہ علی جمیع الانبیاء والمرسلین والائمۃ الھداۃ
المھدیین بھم نتولی ومن اعدائھم نتبرء الی اللہ"

اللہ کے فضل سے ہم اس درس میں جس نئی گفتگو کا آغاز کر رہے ہیں وہ قرآن کریم میں ولایتِ قرآن کے بارے میں ہے یہ گفتگو ہماری گذشتہ بحث "قرآن میں کرامت انسان" سے بھی مربوط ہے اور بعد کی بحثوں کے لئے بھی راہ ہموار کرے گی۔

ولایت۔ لغت میں

ولایت کا معنی لغت میں قرب اور نزدیکی ہے اس کا شمار مفاہیم نسبی میں سے ہوتا ہے۔ اگر ایک چیز کسی دوسری کے ساتھ ہو جائے تو کہتے ہیں " وَلِیَہ " یعنی اس کے نزدیک ہو گئی کیونکہ جب کوئی چیز کسی شخص یا کسی شے کے نزدیک ہوتی ہے تو وہ شخص یا شے بھی اس کے نزدیک ہوتے ہیں۔ لہٰذا ولایت اخوت کی طرح طرفین میں مساوی نسبت سے عبارت ہے کیونکہ اس میں نسبت کے دونوں طرف ایک جیسے ہوتے ہیں یہ بات باپ بیٹے کے مابین نسبت کے برخلاف ہے چونکہ باپ بیٹے میں طرفین مساوی نہیں ہوتے۔ پہلے طرح کی نسبت کو موافقۃ الاطراف کہا جاتا ہے اور دوسری طرح کی نسبت کو متخالفۃ الاطراف کہا جاتا ہے۔

لہٰذا اگر انسان اللہ کا ولی ہو تو خدا بھی اس کا ولی ہے۔ جیسے اگر خدا کسی کا ولی ہو، یعنی اس کے نزدیک ہو تو وہ بھی اللہ کا ولی ہو گا کہ متوافقۃ الطرفین کی نسبت کا یہی تقاضا ہے۔

(ولایت میں نسبت متساوی ہو یا برابری)
(اخوت میں ہیں۔ باپ بیٹے میں نہیں)

ولایت۔ قرآن میں:

قرآن میں جس ولایت کا تذکرہ ہے وہ ایک ایسے قرب خاص سے عبارت ہے کہ جو ممکن ہے ایک طرف سے حاصل ہو اور دوسری طرف نہ ہو بلکہ ممکن ہے دوسری طرف سے دوری ہو مثلاً اللہ تعالےٰ کافر اور مومن سے یکساں نزدیک ہے جیسا کہ قرآن میں ہے۔

"ونحن اقرب الیہ من حبل الورید" (ق-۱۶)

ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہیں۔

جبکہ دوسری طرف مومن عبادات اور اعمال قربت بجالاکر خدا کے قریب ہوتا ہے اور کافر اعمالِ قربت کو ترک کرکے اور برے اعمال کے ارتکاب سے اللہ سے دور ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے

"اولئک ینادون من مکان بعید" (حم سجدہ-۴۴)

(وہ تو ایسے ہیں جیسے بہت دور رہنے والوں کو صدا دی جاتی ہو۔)

لہٰذا اگر تفاوت اور دوری ہے تو بندوں کی طرف سے ہے خدا کی طرف سے نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ تو سب کے نزدیک ہے لیکن سب اللہ کے نزدیک نہیں بلکہ بعض نزدیک ہیں اور بعض دور۔

اشراقی اور مقولی نسبت:

قرآنِ کریم میں جس ولایت کا تذکرہ ہے وہ عام لغوی معنی میں نہیں ہے کہ جسے متوافقۃ الطرفین والی نسبت کہا جاسکے لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر کوئی خدا کے نزدیک ہے تو خدا بھی اس کے نزدیک ہے اور اگر خدا کسی کے نزدیک ہے تو وہ بھی خدا کے نزدیک ہے کیونکہ طرفین میں پیدا ہونے والے ایسے روابط اعتباری نسبتوں میں ہوتے ہیں حقیقی نسبتوں میں نہیں اس لیے کہ اعتباری و مقولی نسبتیں دو طرف پر مبنی ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی دیوار کے نزدیک ہو تو وہ دیوار بھی اس کے نزدیک ہوگی۔ قرب ایک امرِ نسبی ہے جس کا تعلق دو طرف سے ہے اس میں ایک

مضاف ہوتا ہے اور ایک مضاف الیہ اس طرح سے کہ ہر حکم جو ایک طرف پر لگایا جاسکے دوسری طرف کے لیے بھی ہے (یعنی دونوں مضاف الیہ بھی ہو سکتے ہیں اور مضاف بھی) کیونکہ یہ ایک اعتباری نسبت ہے اور دو طرف پر منحصر ہے اور اس میں ممکن نہیں ہے کہ ایک طرف ایک صفت کی حامل ہو اور دوسری طرف اس سے محروم ہو۔ اس کی مثال زمان و مکان کا قرب و بُعد ہے اگر کوئی موجود کسی زمان و مکان کے نزدیک ہو تو وہ مکان یا زمان بھی اس کے نزدیک ہوں گے اگر کوئی موجود کسی معین زمان یا مکان سے دور ہو تو وہ زمان یا مکان بھی اس سے دور ہوگا لیکن اگر نسبت واقعی ہو کہ جسے نسبت واقعی کہتے ہیں تو اس نسبت کی اساس مضاف الیہ پر استوار ہے اس میں نسبت بعد ازاں ظہور کرتی ہے اور نسبت کے زیرِ سایہ مضاف پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک انسان اور اس کی نفسانی صورتوں کے مابین نسبتِ علمی موجود ہے۔ انسان عالم ہے اور یہ نفسانی صورتیں معلومات، عالم اور ان معلومات کے درمیان نسبتِ علمی موجود ہے اور یہ نسبت ایک اشراقی نسبت ہے یعنی نفس ایک اشراق و نور کے ذریعے ایک صورت کو اپنے اندر ایجاد کرتا ہے۔ چونکہ نفس کے اندر پہلے سے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی کہ روح اس سے مقولی و اعتباری نسبت برقرار کرے بلکہ نفس اس صورت کو خود ہی تخلیق کرتا ہے اور جب خلق کر چکتا ہے تو وہ مضاف نفس کی تخلیق کے زیرِ سایہ نفس سے ارتباط قائم کرتا ہے۔

نتیجۂ بحث یہ ہوا کہ نسبت دو طرح کی ہے ایک نسبتِ اعتباری یا مقولی اور ایک نسبتِ اشراقی۔ نسبتِ اعتباری میں نسبت طرفین کے تابع ہے اور اس میں اس کا ربط طرفین سے یکساں ہے۔ لیکن نسبتِ اشراقی میں طرفین یکساں نہیں بلکہ مضاف الیہ اصل ہے اور مضاف اضافہ و نسبت کا نتیجہ ہے اور نسبت کی برکت سے مضاف پیدا ہوتا ہے۔ بات کو ذہن سے قریب کرنے کے لیے قرآن کریم میں موجود مسئلہ خطاب کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

نسبت کی دو اقسام: ۱) نسبت اشراقی ۲) نسبت مقولی

قرآن میں خطاب کی قسمیں :

قرآن کریم میں خطاب کی دو قسمیں ہیں : (۱) اعتباری خطاب (۲) تکوینی خطاب

اعتباری خطاب وہ ہیں کہ جن کے ہمراہ تکلیفی[1] امر و نہی ہو مثلاً

"یاایّھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام"

اے ایمان والو روزے تم پر فرض کیے گئے ہیں[2]۔

یا

"اقیموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ"

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو[3]۔

خطاب اعتباری کے لیے متکلم اور مخاطب کا وجود ضروری ہے لیکن خطاب حقیقی ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے فقط متکلم کی ضرورت ہے اور مخاطب خطاب سے پیدا ہوتا ہے اور خطاب کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ مثلاً

"انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون"[4]

اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے کہہ دیتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

یہ خطاب ایک خطاب تکوینی ہے نہ کہ اعتباری۔ یہ مخاطب کا محتاج نہیں ہے بلکہ مخاطب آفرین ہے البتہ اس لحاظ سے کہ معدوم محض سے خطاب محال ہے تکوینی خطاب میں موجودات کی علمی صورتیں مخاطب قرار پاتی ہیں۔ یعنی اللہ تعالےٰ اس

---

[1] تکلیفی سے مراد تکلیف شرعی ہے یعنی وہ ذمہ داری جو شریعت کی طرف سے عائد ہوتی ہے۔ (مترجم)

[2] بقرہ ۱۸۳۔ [3] بقرہ ۴۳، ۸۳، ۱۱۰۔

[4] یٰسین ۸۲۔

خطاب کی دو صورتیں ہیں: ا خطاب حقیقی = مخاطب کا مستلزم ہے ۲ خطاب اعتباری

موجود سے خطاب فرماتا ہے کہ جو اس کے منشاء علم میں حضور رکھتا ہے اور وہ موجود اس خطاب کے بعد تنزل کرتا ہے اور وجودِ خارجی پیدا کرتا ہے۔

پس خطاب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطاب اعتباری کہ جس کے لئے متکلم و مخاطب دونوں کا وجود ضروری ہے اور دوسرا خطاب حقیقی کہ جو فقط متکلم کا نیازمند ہے اور مخاطب اس کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔

ولایت نسبتِ اشراقی ہے:

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ نسبتِ مقولی اور خطابِ اعتباری میں دو طرف کی ضرورت ہے جب کہ نسبتِ اشراقی اور خطابِ تکوینی صرف ایک پائے پر استوار ہیں۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں۔ ولایت کا بھی یہی حال ہے یعنی ولایتِ حقیقی ایک ایسا امر ہے کہ جس کی باگ ڈور فقط مولیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس کی ولایت کا حامل اس رابطۂ ولائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تاہم ولایتِ اعتباری دو پایوں پر استوار ہے جیسے انسانوں کے مابین رشتۂ ولاء و قربت ہوتا ہے تاہم بعض مواقع میں اس رابطے کا حکم ہوا ہے اور بعض مواقع کے لیے اس سے منع کیا گیا ہے۔ جہاں طرفین مومن ہوں وہاں اس ولایت کا حکم دیا گیا ہے لیکن جہاں ایک مومن ہو اور دوسرا کافر وہاں اس ولایت سے منع کیا گیا ہے۔

"ولی" اللہ کے اسماءِ حسنیٰ میں ہے:

اللہ تعالےٰ کی توفیق سے ہمارا زیرِ بحث موضوع کوئی اجتماعی و فقہی یا ان سے ملتا جلتا نہیں بلکہ ہم انسان کے ولی اللہ ہونے کے لیے قرآنِ کریم کی ہدایات کے درپے ہیں۔ تاہم ولایتِ اعتباری کو زیرِ بحث لائے بغیر اور اصولِ مقدماتی کی تحقیق کے بنا اس بلند ہدف کا حصول آسان نہیں۔ لہٰذا راہ ہموار کرنے کے لئے چند مقدمات پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن ہمیں جس پہلے نکتے کی تعلیم دیتا ہے وہ یہ ہے کہ

اللہ تعالےٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک "ولی" ہے "فاللہ ھو الولی"[1] نہ فقط یہ کہ خدا ولایت رکھتا ہے بلکہ ولی فقط خدا ہی ہے، کیونکہ توحیدِ افعالی کی بنا پر معقول نہیں ہے کہ (خدا کے سوا کوئی) موجود، کسی شخص یا کسی شئے کی سرپرستی کی طاقت رکھتا ہو۔ ولایت، سرپرستی کے معنی میں فقط خداوند سبحانہ کے لیے مختص ہے اور جہاں قرآن میں شیطان اور طاغوت کے لئے ولایت کا ذکر ہوا ہے مثلاً ان آیات میں

"اللہ ولی الذین اٰمنوا ..... والذین کفروا اولیاؤھم الطاغوت"[2]

تو اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ شیطان اور طاغوت خدا کے مدِمقابل ولایت کے حامل ہیں بلکہ خود شیطان اللہ کا ایک مامور ہے اور اگر کوئی اللہ کی ولایتِ خاصہ کے زمرے میں نہ آئے تو اللہ تعالےٰ شیطان کو اس شخص پر مسلط کر دیتا ہے۔ وگرنہ ولایتِ شیطان ولایتِ رحمٰن کے متوازی نہیں بلکہ کوئی موجود بھی اللہ کے مقابل نہیں ہے کیونکہ "لا شریک لہ"[3] و "لیس کمثلہ شئ"[4] لہٰذا طاغوت شیطان یا ان جیسوں کی ولایت عذابِ الٰہی کے طور پر اللہ کی طرف سے نافذ ہوتی ہے۔

انسان کو اسمِ "ولی" کا مظہر ہونا چاہیئے:

مختصر یہ کہ سرپرستی کے معنی میں ولایت صرف اللہ تعالےٰ سے مختص ہے

---

[1] شوریٰ ۹

[2] اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ایمان والوں کا ولی ہے..... اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کا ولی طاغوت ہے (بقرہ ۲۵۷)

[3] انعام ۱۶۳ [4] شوریٰ ۱۱

لہٰذا اللہ تعالےٰ اس نام سے اپنی ستائش کرتا ہے اور اس نام سے اپنا تعارف کرواتا ہے "فاللّٰہ ھو الولی" یہ وہ نام ہے کہ جو اللہ اپنے لیئے ذکر کرتا ہے اور اس سے اپنی توصیف کرتا ہے تاکہ کوچۂ الٰہی کے مسافروں کی تشویق ہو تاکہ وہ بھی اس راہ کو طے کریں اور اسلام کے مظہر بن جائیں۔ اللہ کے انبیاء اور اولیاء اس نام مبارک کے مظہر ہیں اسی لیے وہ انتہائی مفید شخصیات ہوتی ہیں آپ بھی کوشش کریں کہ "ھو الولی" کے مظہر بن جائیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام ولایت کے خلق کے مظہر تھے انہوں نے فرمایا:

"انیّ اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فأنفخ فیہ فیکون طیرًا باذن اللّٰہ"

"میں تمہارے لیے مٹی سے ایک پرندے کی صورت خلق کروں گا پھر میں اس (پرندہ) میں پھونک ماروں گا اور وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جائے گا"[1]

لیکن اگر آپ ولایت فی الخلق کے مظہر نہ بن سکیں اور اولیاء اللہ کی طرح طی الارض نہ کر سکیں تو کم ازکم آپ اپنے نفس کے امور پر ولی ہو جائیں یعنی اپنی آنکھ کے ولی، اپنے کان پر ولی، اپنے وہم و خیال پر ولی اور اپنی شہوت و غضب پر ولی ہو جائیں۔ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم گناہ نہ کریں لیکن ہمارے بس میں نہیں ایسا اس لیئے ہے کہ ان کی شہوت ان کا مولا بن گئی ہے جو لوگ غصے کی حالت میں اعتدال کی طاقت نہیں رکھتے ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کا غصہ ہی ان کا مولا ہو گیا ہے جس کسی کے قوائے نفس میں سے کوئی قوت اس کی مولا ہو جائے وہ ہرگز "ھو الولی" کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ سنی اور شیعہ دونوں سلسلوں سے چند ایسی روایات پہنچی ہیں کہ جن کے مطابق جو شخص رضا و غضب ہر دو عالم میں اپنا مالک رہے

---

[1] آل عمران ۴۹

مظہر ولایت انسان نہیں ۔ اگر شخص ولایت فی الخلق [illegible]
تو آپ ولایت کا انتہا [illegible] نہیں [illegible]
اپنے نفس کے ولی بن جائیں

وہ اہلِ سعادت میں سے ہے۔

ایسی روایات اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ایسے لوگ کم از کم اپنی نفسانی خواہشات میں "ھو الولی" کا مظہر ہوتے ہیں۔ انسان کو جو کم از کم ولایت حاصل کرنا چاہیے یہ ہے کہ اپنی آنکھ، کان اور دیگر قوتوں کا مولا ہو جائے۔ ہر چیز کہ جو آنکھ چاہے اسے نہ دیکھے بلکہ ہر چیز کہ جو وہ چاہے آنکھ اسے دیکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اعطوا اعینکم حظّھا من العبادۃ"

اپنی آنکھوں کو عبادت میں سے حصہ دو

عرض کیا گیا

"وما حظّھا من العبادۃ یا رسول اللہ"

کہ عبادت سے ان کا کیا حصہ ہے

تو رسولِ اکرم (ص) نے فرمایا

"النّظر فی المصحف والتّفکّر فیہ والاعتبار عند عجائبہ"[1]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اور قرآن سے اخذ کی گئی علمی کتب کا مطالعہ اور ان میں غور و فکر کرنا آنکھ کے حق کی ادائیگی ہے۔ ایسی آنکھ صاحبِ چشم کی ولایت میں ہے اور وہ اس کا مولا ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنی آنکھ کو اس آیت کے تابع نہ بنا سکے

"قل للمؤمنین یغضّوا من ابصارھم"

مومنین سے کہیئے کہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں[2]

تو اس کی آنکھ اس کی مولا ہے اور وہ اس کا مملوک۔

لہٰذا نفس سے باہر حصولِ ولایت اگرچہ بہت مشکل ہے لیکن نفس پر ولایت کا حصول سب پر لازم ہے تاہم یہ بھی کوئی آسان کام نہیں۔

---

[1] المحجۃ البیضاء ۲ [2] نور ۳۰

پس اللہ تعالے کے اسماء حسنی میں سے ایک ولی ہے جیسا کہ اس آیۂ کریمہ میں آیا ہے۔

" ام اتخذوا من دونه اولیاء فالله هو الولی "

کیا انھوں نے اس (اللہ) کو چھوڑ کر دوسرے ولی بنا لیے ہیں حالانکہ اللہ ہی سرپرست ہے[1]

اس کی دلیل اسی آیت کے دوسرے حصے میں یوں ذکر کی گئی ہے۔

" وهو یحی الموتی وهو علی کل شیء قدیر "

اور وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔

اس کا معنی یہ ہے کہ زندگی اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہی قادرِ مطلق اور ولی ہے۔

جو انسان تہذیبِ نفس کی کوشش کرتا ہے یہ امر اس کے لیے ظاہر ہے لیکن دوسروں کے لیئے یہ معنی خطرے کی حالت میں ظاہر ہوتا ہے یعنی انسان سمجھتا ہے کہ جسے وہ اپنا سمجھتا تھا وہ اس کے درد کی دوا نہیں کرتا اور دوسرے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ یوں ہم خطر معلوم ہوتا ہے کہ

" هنالك الولایة لله الحق "[2]

اور یہاں سرپرستی تو اللہ ہی کی ہے کہ جو حق ہے۔

ولایت مولویت اور سرپرستی کے معنی میں ہے سورۂ کہف میں مذکورہ آیت سے پہلے کی آیات یوں ہیں۔

" واحیط بثمره فاصبح یقلب کفیه علی ما انفق فیها وهی خاویة علی عروشها و یقول یالیتنی لم اشرك بربی احدا ولم تکن له فئة ینصرونه من دون الله

---

[1] شوریٰ - ۹ [2] الکہف - ۴۴

کسوٹی ولایت خدا کا اظہار کیا مت ... (سورۂ کہف ۴۴)

وما کان منتصراً ھنالک الولایۃ للہ الحق "

اور اس کا پھل آفت رسیدہ ہوا اور وہ اس (محنت و سرمایہ) پر ہاتھ ملنے لگا جو کہ اس نے اس پر خرچ کیا تھا اور وہ (باغ) بالکل تباہ و برباد ہو گیا اور وہ کہنے لگا ہائے افسوس۔ اے کاش میں نے اپنے رب کو کسی کا شریک نہ بنایا ہوتا اور اللہ کے سوا اس کے لیئے کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود اپنے آپ کو (عذاب) سے بچا سکا اور یہاں بھی سرپرستی تو اللہ ہی کے لیئے ہے [۱]

یعنی اس سرمایہ دار سے جو کچھ بھی کہا گیا اس نے کوئی نصیحت قبول نہ کی اور آخر کار ایک دن اسے ایسا دیکھنا پڑا کہ جب اندوہ و غم کی شدت سے اپنے ہاتھ ملتا تھا۔ جو کچھ سرمایہ اس باغ پر اس نے صرف کیا تھا وہ ایک دم اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ کوئی اس کا معین و مددگار نہ تھا۔ خود اس کے بس میں بھی نہ تھا کہ انتقام لے سکے جب یہ واضح ہو گیا کہ وہ اپنی مدد کر سکتا ہے اور نہ انتقام لے سکتا ہے اور نہ وہ دوسروں کی مدد سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے تو اس وقت وہ سمجھا کہ "ھنالک الولایۃ للہ الحق "

ظہورِ حقیقت :

"ھنالک" کا یہ مطلب نہیں کہ جب باغ جل گیا اور سب طاقت والے چلے گئے تو پھر اللہ کی نوبت آئی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اس نکتے کو تب سمجھا ایسا نہیں ہے کہ ولایت الٰہی کی بھی باری آتی ہو بلکہ آیتِ مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ :

"ھُنَالِکَ تَظْھَرُ اَنَّ الْوِلَایَۃَ التَّامَّۃَ مُنْحَصِرَۃٌ لِلّٰہِ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی"

---

[۱] الکہف - ۴۲ - ۴۴

یعنی اب ظاہر ہوا کہ ساری کی ساری ولایت اللہ تبارک وتعالےٰ میں منحصر ہے۔
نہ یہ کہ:
"هُنَالِكَ تَحْدُثُ الْوِلَايَةُ"

یہ بات سورۂ نور کی اس آیت مبارکہ کی طرح ہے:
"وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ"
"وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے اعمال بیابان میں سراب کی طرح سے ہیں" نور۔ ۳۹
"قیعہ" و "قاع" چٹیل بیابان کے معنی میں ہیں جب بیابان کھلا ہو تو حد نظر وسیع ہوگا ایسے میں انسان کو ہر افق میں صاف پانی چمکتا نظر آئے گا اور اگر انسان پیاسا ہوگا تو اس کی طرف دوڑے گا لیکن ایک عاقل انسان جانتا ہے کہ یہ سراب ہے آب نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی پیاسا نہ ہوگا تو اگرچہ وہ سراب کو آب سمجھے لیکن اس کی طرف جائے گا نہیں کافر اس پیاسے کی مانند ہے جو سراب کو آب سمجھے اور اس کی طرف دوڑ پڑے اور جب اس تک پہنچے تو اسے کچھ دکھائی نہ دے ایسے میں وہ اللہ کو پاتا ہے۔
اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اس حال میں وہ سمجھتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ تھا نہ یہ کہ خدا اسے وہاں ملتا ہے اور قبل ازیں وہ اس کے ہمراہ نہ تھا کیونکہ،
"هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ"
("تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے"۔ حدید۔ ۴)

یا

"هو الذی فی السماء اله و فی الارض اله"

آسمان میں بھی وہی اللہ ہے اور زمین میں بھی وہی اللہ ہے۔ (زخرف۔ ۸۴)
اسی طرح کی دیگر آیات بھی ہیں۔ لہٰذا یہ جو سورۂ کہف میں فرمایا گیا ہے کہ جس دن دولت مند انسان اپنا مال کھو بیٹھے اس دن "هنالك الولاية لله الحق"

اس معنی میں نہیں کہ اس وقت دوسروں کی ولایت ختم ہو گئی اور خدا کی ولایت وجود میں آگئی بلکہ اس معنی میں ہے کہ ولایتِ خدا اس شخص کے لیے ظاہر ہوتی ہے اور اسی طرح سورۂ نور میں " وَ وجد اللّٰہ عندہ " سے مراد یہ نہیں ہے کہ خدا اُس وقت حضور و ظہور رکھتا ہے کیونکہ خدا تو تمام حالات میں حضور رکھتا ہے " هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ " بہر حال فرق یہ ہے کہ انسان کبھی اسے دیکھتا ہے اور کبھی نہیں دیکھتا۔ یہ امر اس بات کی علامت ہے کہ یہ ولایت نسبتِ اشراقی ہے اور معقولی کی طرح دو طرف سے وابستہ نہیں ہے بلکہ فقط مضاف الیہ سے وابستہ ہے۔ معیت کا بھی یہی حال ہے کبھی یہ اعتباری ہوتی ہے مثلاً یہ کہ دو افراد ایک جگہ معیت رکھتے ہوں یا دو عضو ایک ہیئت اور ایک امرِ اعتباری کے تحت اکٹھے ہوں ایسی معیت دونوں طرف سے یکساں ہوتی ہے۔ زید امر کی معیت میں ہے اور امر بھی زید کی معیت میں ہے۔ لیکن تکوینی لحاظ سے معیت یک طرفہ ہوتی ہے خدا معیت رکھتا ہے لیکن کافر تنہا ہوتا ہے اور جب کوئی خطرہ آپہنچتا ہے تو پھر سمجھتا ہے " هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ " اور جب سراب تک پہنچتا ہے " وجد اللّٰہ عندہ " پھر اپنے آپ کو خدا کے ساتھ پاتا ہے اور خدا کو اپنے ساتھ دیکھتا ہے۔

نتیجۂ سخن:

مختصر یہ کہ قرب کے معنی میں ولایت دو طرح کی ہے ۱۔ قربِ اعتباری کہ جس کی نسبت اپنے متوالیوں اور حاملین سے ایک جیسی ہوتی ہے ۲۔ قربِ حقیقی کہ جس کا حال دیگر اشراقی و حقیقی نسبتوں اور اضافتوں کا سا ہے۔ ان میں اضافہ کی باگ ڈور مضاف الیہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور مضاف اس کے تابع ہوتا ہے۔ معیت و ولایت وغیرہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔

اللہ تعالےٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک ولی ہے انسان کو چاہیئے کہ وہ

کوشش کرے اگرچہ اس کے اپنے نفس کی حدود تک ہی ہو اسلام کا مظہر بن جائے تاکہ وہ اس طریقے سے مقدمات طے کرلے، اپنی ذات سے باہر آجائے اور وسیع تر علاقے کا ولی ہو جائے۔

"والحمد للہ رب العالمین"

○

درس ۲

گفتگو کی منطقی تنظیم: ہماری گفتگو قرآنِ کریم میں ولایتِ انسان کے بارے میں ہے اس بحث کی منطقی تنظیم یہ ہے کہ پہلے ولایت کا معنیٰ کیا جائے یعنی "الولایۃ ما ھی" اس کے بعد اس کی اصل ہستی اور وجود کے بارے میں بحث کی جائے یعنی "الولایۃ ھل ھی" یعنی آیا وہ ہے بھی یا نہیں۔ بعد ازاں ولایت کی اقسام بیان کی جائیں یعنی "الولایۃ کم ھی" اس سلسلے میں ہر قسم کے بارے میں حکم مشخص کیا جائے، پھر ہر قسم کے لیے بعض احکام کی علتِ ثبوت کو واضح کیا جائے یعنی "الولایۃ لِمَ ھی"

ولایت کیا ہے؟ پہلی بات یہ کہ "الولایۃ ما ھی" اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ولایت جو اتصال و قرب کے معنی میں ہے اس کا استعمال کبھی امورِ معنوی میں ہوتا ہے اور کبھی امورِ مادی و جسمانی میں۔ ایسے دو امر کہ جو ایک دوسرے کے آگے پیچھے واقع ہوں ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان دو کے مابین توالی ہے۔ دو واقعات کہ جو یکے بعد دیگرے رونما ہوں تو کہا جاتا ہے کہ ان کے مابین موالات ہے چونکہ "وَلِیَ" کا معنی ہے قرب۔ دوسرا واقعہ چونکہ پہلے کے قریب ہوتا ہے اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے مابین "ولاء" یا "موالات" یا "توالی"

ہے۔ حوادث و واقعات یکے بعد دیگرے یوں رونما ہوتے ہیں جیسے کڑیاں ہوں اور یہ کڑیاں متوالی بھی ہیں۔ لہٰذا موالات اور توالی واقعات کے باہمی ارتباط سے عبارت ہے اور اس سے مراد ہر واقعے کا دوسرے واقعے سے قرب ہے۔

جیسے مادی و محسوس امور میں یہ موالات موجود ہے ایسے ہی یہ توالی معنوی امور میں وجود رکھتی ہے۔ دو مقدمے باہم موالی و متوالی ہوں گے تو ان کا کوئی نتیجہ ہوگا اگر ایک قضیے کا رابطہ دوسرے قضیے سے علت و معلول کے لحاظ سے ہو تو کہتے ہیں کہ ایک مقدم ہے اور دوسرا تالی ہے۔ تالی چونکہ مقدم کے بعد اور ساتھ ہے اس لیے اس کے لیے تالی یا والی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

پیہم اور متوالی امور کے مابین ارتباط ضروری ہے اگر دو چیزوں کے درمیان کوئی رابطہ موجود نہ ہو جیسے انسان کے پاس پتھر پڑا ہو تو ان دونوں کے درمیان رابطہ ولائی بے معنی ہے۔ اس رابطہ و تاثیر کی دو قسمیں ہیں، یا متقابل و دو طرفہ ہوتا ہے یا یکطرفہ۔ اگر تاثیر متقابل و دو طرفہ ہو تو موالات بھی دو طرفہ ہوگی یعنی پہلا دوسرے کا ولی ہے لیکن دوسرا بھی پہلے کا ولی۔ لیکن اگر تاثیر یکطرفہ ہو تو پہلا دوسرے کا ولی ہے لیکن دوسرا پہلے کا مولی علیہ ہے ولی نہیں۔ پہلی صورت میں یہ نسبت متوافقۃ الاطراف ہے مثل اخوت اور دوسری صورت میں متخالفۃ الاطراف ہے جیسے علیت و معلولیت یا ابُوّت و بنُوّت۔

ولایت ایک امر اضافی و نسبی ہے اگر اس میں متقابل تاثیر و تاثر بھی ہو تو اس کا تعلق متوافقۃ الاطراف نسبتوں سے ہوگا کہ جس میں طرفین ایک دوسرے کے ولی ہوتے ہیں لیکن اگر تاثیر و تاثر یک طرفہ ہو تو ولایت بھی یک طرفہ ہوگی۔ ایسے موارد میں ولایت کو واؤ پر زبر ڈال کر پڑھا جائے گا اور ولی کو والی کہا جائے گا کیونکہ ولی کا معنی والی بھی ہے اور مولّٰی علیہ (جس پر ولایت حاصل ہو) بھی ہے۔ مولا بھی ایسے ہی ہے لیکن والی کو خاص طور پر سرپرست کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور جو صاحب ولایت ہو اُس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے "ھنالک الولایۃ للہ الحق" خدا

والی ہے اور ولایت اللہ کو حاصل ہے کیونکہ وہ سرپرست ہے۔
لہٰذا اگر یہ تاثیر و تاثر دوطرفہ ہو تو موالات دوطرفہ ہے اور اگر یک طرفہ ہو تو ولایت کی بات ہے نہ ولایت کی اور اس صورت میں ایک والی ہے اور دوسرا مولیٰ علیہ۔

ولایت کا وجودِ خارجی:

دوسرا سوال ہے " الولایۃ ھل ھی " یعنی کیا ولایت موجود ہے یا نہیں؟
حق بات یہ ہے کہ متقابل تاثیر و تاثر کے معنی میں اثباتِ ولایت آسان ہے کیونکہ انسان حلقۂ نظامِ ہستی سے جدا کوئی موجود نہیں ہے بلکہ اس کا ارتباط دیگر موجودات سے ہے انسان آپس میں بھی ایک دوسرے سے مربوط ہے اس لحاظ سے ممکن ہے دو افراد کے مابین ولائے محبت و نصرت موجود ہو کہ جو متقابل و دوطرفہ تاثیر و تاثر سے عبارت ہے۔ ایک انسان دوسرے کا دوست یا ناصر ہے اس طرح سے کہ دونوں کو ایک دوسرے کی محبت بھی حاصل ہے اور نصرت بھی۔ یہ ولایت یعنی محبت و نصرت انسانوں میں موجود متقابل تاثیر و تاثر سے عبارت ہے۔
دنیا میں ولایت کے بھی اصل وجود کا اثبات کسی حد تک آسان ہے چونکہ جو شخص خود کو بہت سے امور میں عاجز و ناتوان پاتا ہے وہ ضروری سمجھتا ہے کہ کسی مدبر کی تدبیر و ولایت کے تحت ہو اور اسے اپنا سرپرست بنائے۔ لہٰذا ولایت کا اصل وجود بھی دنیا میں یقینی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ دوطرفہ ولایت ہو یا یک طرفہ، سوچ سمجھ کر عمل کرے۔ عقل و وحی کی روشنی میں ولی کے انتخاب میں سمجھ داری سے کام لے۔ قرآن کریم نے متقابل ولایت کے بارے میں فرمایا ہے کہ مومنین آپس میں بھائی ہیں اور بھائیوں کو چاہیئے کہ باہمی موالات کی حفاظت کریں، لہٰذا فرماتا ہے۔

" انّما المؤمنون اخوۃ "

(یعنی مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں) ۔ (حجرات ۔ ۱۰)

نیز یہ بھی فرمایا:

"والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض"

(اور مومنین و مومنات آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء ہیں) (توبہ ۔ ۷۱)

یہ دونوں جملے ادبی اصطلاح میں خبریہ ہیں لیکن انشاء کے لئے آئے ہیں یعنی دعوت دیتے ہیں کہ اے مومنو! آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بن کے رہو، ایک دوسرے کے اولیاء بن کے رہو اور باہم ولاء رکھو۔ چونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان مومن سے بھی ولاء رکھے اور غیر مومن سے بھی لہٰذا قرآن کریم نے ولاء کا راستہ بھی انسان کو بتایا ہے اور نفرت و عداوت کی علامتیں بھی اس کے راستے میں نصب کر دی ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:

کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے اولیاء نہ بنائیں۔

بلکہ یہاں تک کہ کوئی بھی ہو کافروں میں سے کسی سے رشتۂ ولایت قائم نہ کریں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ:

"لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء"

(میرے اور خود اپنے دشمنوں کو اولیاء قرار نہ دو) ۔ (ممتحنہ ۔ ۱)

اور اس سے بھی بڑھ کر فرماتا ہے کہ اگر تمہارے آباء اور اولاد بھی تمہاری دینی روش پر نہ ہوں تو ان سے بھی ولائی رابطہ برقرار نہ کرو۔ اگر ابتداء تخلیہ[1] سے نہ ہو یعنی جھوٹی اور باطل ولاؤں سے اگر نفس پاک نہ ہو تو تجلی اور تحلّی[2] تک کبھی بھی رسائی نہ ہو سکے گی۔ ابتدا میں انسان کے لئے وہ امر مشخص ہونا چاہیئے[3] جس سے اُسے دُوری اختیار

---

[1] تخلیہ سے مراد اپنے آپ کو رذائلِ اخلاقی سے پاک و خالی کرنا ہے۔

[2] تحلی سے مراد زیورِ اخلاق و کمالاتِ انسانی سے آراستہ ہونا ہے۔

[3] یعنی جن امور سے انسان کو دوری کرنا چاہیئے۔

کرنا ہے پھر اسے چاہیئے کہ اپنے میلان کو کوئی جہت بخشے۔

خداوند عالم نے جس طرح برأت کے مسئلے کو کبھی جملۂ انشائیہ میں اور کبھی جملۂ خبریہ کی صورت میں بیان کیا ہے مسئلۂ تولّی کو بھی کبھی انشائی اور کبھی خبری صورت میں بیان کیا ہے.....

۲۲/دسمبر ۱۹۸۸ء بدھ کے دن چار بج کر پچاس منٹ کا وقت ہوا چاہتا تھا کہ اولیاء کفر (شرق و غرب کی سپر طاقتوں) کی طرف سے صدام کو دیئے گئے بموں سے قم کے بازار پر بمباری ہوئی کہ جو بہت سے بے گناہ شہریوں کی شہادت کا باعث بنی۔ بموں کی آواز اور حاضرین کے "اللہ اکبر" اور "جنگ رہے گی جنگ رہے گی" کے نعروں سے استادِ محترم کا سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا اور درس یہیں ختم ہو گیا۔ والحمد للہ رب العالمین۔

○

درس سوم

یاددھانی

ہماری بحث قرآن کریم میں ولایتِ انسان کے بارے میں ہے۔ بحث کے لئے بہترین طریقہ منطقی روش کا لحاظ کرنا ہے کہ سب سے پہلے یہ واضح ہو کہ ولایت ہے کیا؟ " الولایة ما ھی؟" اس کے بعد وجودِ ولایت کے بارے میں بحث کی جائے کہ " الولایة ھل ھی؟" اور پھر اس کے ثبوت پر دلائل یا اس تک پہنچنے کے لئے راہ کی شناخت کی جائے کہ " الولایة لِمَ ھی؟" یا دوسرے الفاظ میں یہ دیکھنا ہے کہ ولایت کا مبدأ فاعلی اور اس مقام ولایت سے حاصل شدہ سیر و سلوک کیا چیز ہے؟ اور آخر میں اس کی اقسام کے بارے میں بحث ہو کہ " الولایة کم ھی " نیز ان اقسام میں سے ہر ایک کے آثار اور لوازمات بھی ذکر ہونگے۔

ولایت کی ماہیت

کبھی ولایت کی حقیقت کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وِلایت (واؤ کے نیچے زیر) اور وَلایت (واؤ کے اوپر زبر) کے درمیان بنیادی اور نوعی اختلاف اور مغایرت پائی جاتی ہے۔ لفظِ وِلایت (واؤ کے نیچے زیر) محبت، نصرت و مدد اور اسی طرح کے دوسرے معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن وَلایت (واؤ پر زبر) تدبیر اور سرپرستی کے معنی میں ہے۔ ناگزیر طور پر محبت و نصرت کے معنی میں ولاء کی بحث تدبیر و سرپرستی کی ولاء کی بحث سے علیحدہ اور جدا ہو گی۔ لہٰذا ہم بھی فی الحال ان دونوں کے بارے میں جدا جدا بحث کرتے ہیں تاہم بحث کے آخر میں انشاء اللہ تعالےٰ واضح ہو جائے گا کہ ان دونوں کا جامع حقیقی موجود ہے

اور نوعی طور پر یہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔

ولائے نصرت و محبت

ماہیتِ ولایت کی بحث میں ہم ولاء نصرت و محبت کے بارے میں بھی تحقیق کریں گے اور ولاء تدبیر و سرپرستی کے بارے میں بھی۔

ولاء نصرت و محبت سے مراد یہ ہے کہ دو چیزیں قربت کی وجہ سے ایک دوسرے کی دوست ہوں اور باہم دیگر ناصر و مددگار ہوں۔ یہ امر انسانوں کے مابین بھی ہو سکتا ہے انسان اور خدا کے درمیان بھی اور اللہ تعالےٰ اور اس کے بندوں کے مابین بھی۔

یہ قربت مادی امور میں متوافقۃ الاطراف نسبت کی حامل ہے یعنی اگر ایک جسم دوسرے کے نزدیک ہو تو وہ دوسرا بھی اس کے نزدیک ہو گا اسی طرح اگر ایک جسم دوسرے سے دُور ہو تو وہ دوسرا بھی اس سے دور ہو گا لیکن روحانی امور میں ممکن ہے یہ نسبت متخالفۃ الاطراف ہو یعنی ممکن ہے ایک امر دوسرے کے نزدیک لیکن دوسرا اس سے دور ہو، مثلاً اللہ تعالےٰ سب انسانوں کے نزدیک ہے چاہے وہ مومن ہوں یا کافر جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

"نحن اقرب الیہ من حبل الورید"

ہم اس سے اس کی رگِ جاں سے بھی قریب تر ہیں۔ (ق - ۱۶)

مومن چونکہ اعمالِ قربت بجا لاتا ہے اس لیے خدا سے نزدیک ہوتا ہے لیکن وہ انسان جس نے اپنے آپ کو اس عاملِ قربت سے محروم رکھا ہے وہ اللہ سے دور ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

اولئک ینادون من مکان بعید۔[1]

وہ تو ایسے ہیں جیسے دور کے مقام سے پکارے جاتے ہوں۔

---

[1] حم السجدہ ۴۴۔

جبکہ اللہ کسی سے دور نہیں ہے کیونکہ "ھو معکم این ما کنتم"[1] (یعنی تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) اللہ تعالےٰ سے کفار کی نسبت ایسی ہے جیسے بینا سے نابینا کی نسبت۔ بینا نابینا کے نزدیک ہوتا ہے لیکن نابینا بینا سے دور ہوتا ہے۔ بینا نابینا کو دیکھتا ہے لیکن نابینا بینا کو نہیں دیکھتا حالانکہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

بندہ۔ ولایت کا آغاز کرنے والا

ولایت چونکہ قرب سے حاصل ہوتی ہے اس لیے بندہ کی طرف سے شروع ہونی چاہیے کیونکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے چاہے نہ چاہے یہ قرب حاصل ہی ہے اللہ تعالیٰ کہ جو "بکل شئی محیط"[2] (ہر شئی پر احاطہ کئے ہوئے) ہے معقول نہیں کہ کسی چیز سے دور ہو پس اگر انسان اس نسبت کو برقرار کرنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ اچھے اعمال کے ذریعے اپنے آپ کو اللہ کے نزدیک کرے اگر اس نے اپنے آپ کو قریب کر لیا تو آغازِ ولایت یعنی نصرت محبت کی راہ پالی اور اگر نزدیک نہ ہوا تو نصرت و محبت ہی اس کے نصیب میں نہ ہو گی، ولایت کے بالاتر مقامات کی تو بات ہی دور کی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ جیسے اعمال انسان کو اللہ کے نزدیک کرتے ہیں جیسا کہ نماز کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"الصلوٰۃ قربان کل تقی"[3]

(نماز پرہیز گار کو خدا کے قریب کرنے والی ہے۔)

---

[1] حدید۔ ۴

[2] حم سجدہ ۵۴

[3] من لا یحضرہ الفقیہ ج ۱ حدیث ۶۳۷

نیز زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"انّ الزّکوٰۃ جعلت مع الصّلوٰۃ قربانًا"[1]

(زکوٰۃ کو بھی نماز کے ساتھ ساتھ اللہ کے قریب کرنے والی بنایا گیا ہے۔)

جب یہ قرب حاصل ہو جائے تو انسان اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور اللہ بھی انسان کا دوست بن جاتا ہے انسان دینِ خدا کا ناصر بن جاتا ہے جیسا کہ اللہ بھی اس کا ناصر بن جاتا ہے۔ یہ دائرہ کہ جو اوّلین مراحل کا حصّہ ہے اس میں ولایت کا حاصل محبت و نصرت ہے" ان کنتم تحبّون اللہ فاتّبعونی یحببکم اللہ"[2] جیسی آیات ایسی ہی دوطرفہ محبت کے بارے میں ہیں۔ مومن انسان اللہ کا ولی اور دوست ہے اللہ بھی اس کا ولی اور دوست ہے۔ ولاء نصرت کا آغاز بھی اسی مرحلے میں ہو جاتا ہے "ان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبّت اقدامکم"[3] یہ آیۂ شریفہ ولاء نصرت کو ثابت کرتی ہے یعنی تم بھی ناصر ہو اور اللہ منصور ہے اور اللہ بھی ناصر ہے اور تم منصور ہو۔ یہ محبتیں چونکہ دائرۂ فعل میں ہوتی ہیں اور ذاتِ اقدسِ الٰہی کے مقام سے انہیں کوئی سروکار نہیں لہٰذا اللہ کے منصور ہونے سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ کے منصور ہونے سے مراد اس کے دین کا منصور ہونا ہے اور اس کی محبوبیت سے مراد اس ذاتِ اقدس کے کمالات کی محبوبیت ہے وگرنہ ذاتِ خدا کا عنقائے بلند پرواز شکارِ سالک نہیں ہوتا۔ لہٰذا آغاز امر پر انسان فرائض و نوافل کی بجاآوری سے ولاء نصرت و محبت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ ولایت اللہ تعالےٰ کی محبت و نصرت کے معنی میں ہے اور جو کچھ بھی اللہ کے ساتھ ہے حق ہے لہٰذا یہ ولایت محبتِ حق اور نصرتِ حق کے معنی میں ہوگی اور اس سے خلاف نہیں ہو سکتا یعنی اللہ کی محبت و نصرت دنیا میں بھی حق ہے اور موت کے بعد بھی اس کی حقانیت ظاہر ہوگی لیکن اگر کسی نے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰

[2] ترجمہ اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا (آل عمران - ۳۱)

[3] محمد - ۷

موالات، قرب اور ارتباط اللہ کے علاوہ کسی اور سے قائم کر لیا تو وہاں بھی ولایت و تقرب ہوگا لیکن چونکہ غیر اللہ سے ہوگا اس لیے باطل سے ارتباطِ ولائی رکھتا ہوگا کیونکہ قرآن حکیم کے مطابق :

"فماذا بعد الحق الّا الضّلال"

(اور حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا ہے۔) یونس - ٣٢

نیز فرمایا :

"ذٰلك بان الله هو الحق و انّ ما يدعون من دونه هو الباطل" [1]

(یہ اسلیئے ہے کیونکہ بلاشبہ اللہ ہی حق ہے اور جس کسی کو بھی وہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں وہ باطل ہے۔) (حج - ٦٢)

دنیا میں چونکہ حق و باطل مخلوط ہے لہٰذا یہاں حق و باطل میں تمیز نہیں ہوتی لیکن روزِ قیامت کہ جو روزِ ظہورِ حق ہے اور اس دن باطل کے لیئے کوئی گنجائش نہیں ہے باطل محبتوں کی اندرونی حالت کہ جو عداوتِ صادق اور دشمنیِ حق ہے ظہور کریگی۔ اسی طرح نصرتِ کاذب کا باطن بھی کہ جو مخالفتِ صادق ہے ظہور کرے گا اسی لیے قرآن میں ہے :-

"الاخلّاء يومئذٍ بعضهم لبعض عدوٌّ"

(دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔)

ایسا نہیں ہے کہ اس روز دشمن بنیں گے بلکہ قیامت میں ان کی دشمنی ظاہر ہوگی کیونکہ دنیا میں حقیقتاً ایک دوسرے سے دشمنی کرتے تھے اور صورتاً ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لہٰذا یہ صوری محبت اس روز دکھائی نہیں دے گی اور حقیقی دشمنی ظاہر ہو جائے گی۔

"الّا المتقين" [3] مگر متقین، کیونکہ متقین کی محبت حقیقی ہے ان کا درون ان کے بیرون کی طرح حق ہے لہٰذا قیامت میں یہ محبتیں اسی طرح باقی رہیں گی

---

[1] حج - ٦٢ ، لقمان - ٣٠ [2] زخرف - ٦٧ [3] زخرف - ٦٧

اور کھل اٹھیں گی اور حدِ شفاعت کو پہنچ جائیں گی۔لہٰذا شروع شروع میں ولاء و قرب کا حاصل محبت و نصرت ہے چاہے یہ ولاء اللہ سے ہو یا غیرِ خدا سے، فرق یہ ہے کہ اللہ سے ارتباط محبت و نصرتِ صادق ہے جبکہ غیرِ خدا سے ارتباط محبت و نصرتِ کاذب ہے۔

ماہیتِ ولایت۔ قرآن کی نظر میں

بحث کے پہلے حصے "الولایۃ ما ھی؟" (یعنی ولایت کیا ہے؟) کے بارے میں قرآنِ کریم میں بہت سی آیتیں ہیں۔

سورۂ مبارکہ آلِ عمران کی آیت ۲۸ میں فرمایا گیا ہے:

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ

(مومنین ہرگز کافروں کو اپنا ولی اور دوست نہ بنائیں۔)

یہ ممانعت اس لیے ہے چونکہ ولایت کا یہ پہلا مرحلہ کہ جس کا حاصل محبت و نصرت ہے ولایت کے اس آخری مرحلے تک جا پہنچتا ہے کہ جس کا نتیجہ سرپرستی اور تدبیر ہے لہٰذا بعد ازاں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"ومن یفعل ذٰلک فلیس من اللہ فی شیء الّا ان تتّقوا منھم تقٰۃ ویحذّرکم اللہ نفسہ والی اللہ المصیر"

اور جو کوئی ایسا کرے گا اسے اللہ سے کوئی سروکار نہیں سوائے اس صورت کے کہ تمہیں ان سے کسی قسم کا خوف ہو اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف بازگشت ہے۔

سورۂ مبارکہ مائدہ کہ جس میں بہت سے مسائلِ ولایت موجود ہیں کی آیت "۵۱" میں فرمایا گیا ہے:

"یاایّھا الذین اٰمنوا لا تتّخذوا الیھود والنصارٰی اولیاء بعضھم اولیاء

بعض ومن یتولّھم منکم فانّہ منھم انّ اللہ لا یھدی القوم الظّالمین"

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ تو آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو تم سے ان کو دوست بنائے گا وہ ان میں سے ہی (شمار) ہو گا بیشک اللہ ظالم لوگوں کی حمایت نہیں کرتا۔)

یہاں فرمایا گیا ہے کہ انہیں اپنا ولی نہ بنائیں کیونکہ اگر انہیں اپنا ولی یعنی محب، محبوب، ناصر اور منصور بنائے تو ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ وہ مدبر و سرپرست کے معنی میں ولی بن جائیں لہٰذا اللہ تعالےٰ انسان کو اس بڑے خطرے سے بچانے کے لیے ان سے قرب و محبت اور نصرت کی ولاء سے منع کرتا ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۵۴ میں فرمایا گیا ہے:

"یاایّھا الذین اٰمنوا من یرتدّ منکم عن دینہ فسوف یأتی اللہ بقوم یحبّھم و یحبّونہ"

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم میں جو بھی اپنے دین سے مرتد ہو جائیں تو عنقریب اللہ تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور جو اس سے محبت کرتے ہیں۔)

یہ ولایتِ متقابل ہے کہ جس کا نتیجہ محبتِ متقابل ہے لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ اگر تم نے دین سے دوری اختیار کی تو اللہ تعالےٰ ایسوں کو لے آئے گا جو خود بھی اللہ کے محبوب ہوں گے اور اللہ بھی ان کا محبوب ہو گا اور وہ اس کے دین کی مدد کریں گے۔ اسی سورہ کی آیت ۵۷ میں ہے:

"یاایّھا الذین اٰمنوا لا تتّخذوا الّذین اتّخذوا دینکم ھزوًا و لعبًا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و الکفّار اولیاء"

(اے ایمان لانے والو جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی (یعنی یہود و نصاریٰ) ان میں سے ایسوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو کھیل تماشہ

سمجھ رکھا ہے، اور کفار کو دوست نہ بناؤ)

اہلِ کتاب اور کافروں کو اپنے اولیاء نہ بنائیں یعنی اول سے ہی ان سے رابطہ، دوستی قائم نہ کریں تاکہ رفتہ رفتہ اس کا انجام ولاء تدبیر و سرپرستی کا رابطہ نہ ہو جائے۔ اِسی سورہ کی آیت ۵۵ میں ولایتِ امیر المؤمنین علیہ السلام کا ذکر ہے:

"انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون"

(بیشک تمہارے سرپرست اللہ اور اس کا رسول اور وہ ایمان والے ہیں جو کہ نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔)

ان آیات میں اساس ولایت، ولایتِ تدبیر و سرپرستی ہی ہے سورہ انفال کی آیت ۷۲ میں فرمایا گیا ہے:

"ان الذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین اٰووا ونصروا اولئک بعضھم اولیاء بعض والذین اٰمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیء حتّٰی یھاجروا وان استنصروکم فی الدّین فعلیکم النصر الاّ علٰی قوم بینکم وبینھم میثاق واللہ بما تعملون بصیر"

(بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے ساتھ جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور وہ جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تمہارے ذمہ ذرا بھی ان کی سرپرستی نہیں جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں اور اگر دین کے معاملے میں وہ تمہاری مدد چاہیں تو تمہارے ذمہ ان کی مدد (کرنا) ہے سوائے اس قوم کے خلاف جس کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہو اور اللہ دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کرتے ہو)

یعنی مہاجرین وانصار آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء ہیں لیکن جو اہلِ ایمان اور اہلِ ہجرت نہیں ہیں وہ تمہاری ولایت کے حامل نہیں ہیں نہ وہ تمہاری ولاء نصرت ومحبت سے بہرہ ور ہیں اور نہ ہی ولاء تدبیر وسرپرستی سے۔ یہاں پر لفظ "وَلایت" واؤ پر زبر کے ساتھ آیا ہے کہ جو تدبیر وسرپرستی کی بھی نفی کر رہا ہے اور محبت ونصرت کی بھی البتہ کلمۂ "ولایت" واؤ پر زبر کے ساتھ جو سورۂ کہف میں آیا ہے "ھنالك الولایۃ للہ الحق" وہاں ولایت تدبیر وسرپرستی ہی مراد ہے۔

سورۂ انفال کی آیت ۷۳ میں مزید فرمایا گیا ہے:

"والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض"

کفار آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء ہیں اور ایک دوسرے کی محبت و نصرت سے بہرہ ور ہیں مومنین بھی باہم اولیاء ہیں اور ایک دوسرے کی نصرت و محبت سے بہرہ ور ہیں لیکن یہ دو گروہ یکساں نہیں ہیں بلکہ معیارِ ولایت مرکزِ قرب ہی ہے اگر مرکزِ قرب حق ہوا تو یہ ولایت اور نصرت ومحبت حق ہے اور اس کا نتیجہ بر خلاف نہیں نکلے گا اور اگر مرکزِ قرب باطل ہوا تو یہ ولایت اور محبت ونصرت سب باطل ہیں اور ان کا نتیجہ بر خلاف ہی نکلے گا۔

ولایتِ باطل کا انجام

سورۂ مبارکہ توبہ کی آیت ۷۱ میں فرمایا گیا ہے،

"والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض"

(اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں)

اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بھلائی کی دعوت دیتے ہیں۔

"یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر"

(وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔)

اس امر کا راز کہ ولایتِ منافقین باطل ہے اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی محبت و نصرت کاذب ہے سورۂ توبہ کی آیت ۶۷ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

"المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض"

(منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں ایک ہی کچھ ہیں۔)

یعنی وہ مختلف قالبوں میں ایک حقیقت ہیں۔

"یأمرون بالمنکر و ینهون عن المعروف"

ایک دوسرے کو برائی کی دعوت دیتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں۔

برائی کی دعوت اور گناہ پر ابھارنا نصرتِ کاذب اور محبتِ باطل ہے اور جس روز حق ظہور کرے گا معلوم ہو گا کہ یہ ایک دوسرے کے دشمن تھے قیامت میں ان کی عداوت ظاہر ہو گی پیدا نہیں ہو گی جو لوگ دنیا میں دوستی کے لباس میں گناہ کی دعوت دیتے ہیں حقیقتاً ایک دوسرے کے دشمن ہیں قیامت میں دنیا کا یہ جھوٹا لباس اُٹھ جائے گا اور نیچے سے اخروی لباس ان کے راز ظاہر کر دے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ یہ تو ایک دوسرے کے دشمن تھے لہٰذا وہاں ایک دوسرے کو لعنت کریں گے جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۳۸ میں ہے:

"کلما دخلت امة لعنت اختها"

(اور جو بھی ایک امت داخل ہو گی تو اپنی بہن (دوسری امت) پر لعنت کرے گی۔)

وہ سب دوست اور اولیاء کہ جن کا خدا سے رابطہ نہیں ہے وہ باطل سے مربوط ہیں اور باطل سے ارتباط کا حاصل جھوٹی محبت اور کاذب نصرت کے سوا کچھ بھی نہیں اور اگر محبت جھوٹی ہو تو عداوت سچی ہو گی اور اگر نصرت کاذب ہو تو مخالفت صادق ہو گی ممکن نہیں کہ عداوت بھی جھوٹی ہو اور محبت بھی۔ معقول نہیں کہ نصرت بھی کاذب ہو اور مخالفت بھی۔ لہٰذا اگر نصرت کاذب ہے تو مخالفت

حقیقی ہے اور اگر محبت کاذب ہے تو عداوت صادق ہے لہٰذا قرآن کریم فرماتا ہے سب غیر دینی دوست قیامت میں ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے اس امر کا راز سورۂ مبارکہ توبہ میں ہی واضح کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ یہ لوگ درحقیقت دنیا میں ہی ایک دوسرے کے دشمن تھے البتہ سمجھتے نہ تھے:

"المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض يأمرون بالمنكر وينهون عن المعروف ويقبضون ايديهم"

(منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں ایک ہی کچھ ہیں وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں۔) توبہ۔ ۶۷

اسلامی معاشرے کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں، عوام سے انہیں کوئی سرکار نہیں ہوتا اور ایک دوسرے کو برائی کی تشویق کرتے ہیں، منکر کی دعوت دینا اور معروف سے روکنا واقعاً دوستی کے لبادے میں دشمنی ہے۔

ولایتِ حق اور ولایتِ باطل میں امتیاز

ولایتِ حق اور ولایت باطل میں فرق کا معیار مولا ہی ہے اگر مولا خدا ہے تو ولایت حق ہے اور اس کے تمام نتائج بھی حق ہیں اور اگر مولا غیر خدا ہے تو ولایت باطل ہے اور اس کے سارے نتائج بھی باطل ہیں اسی لیے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ عالم میں دو سے زیادہ مولا نہیں ہیں ایک مولا خدا ہے اور دوسرا آگ۔ آگ کافروں اور منافقوں کی مولا ہے "مَأويكم النار هي مولٰكم" (حدید۔ ۱۵) تم ولیٔ نار تھے اور خیال کرتے تھے کہ زید و عمر کے ولی ہو لیکن قیامت میں کہ جب حقیقت ظہور کرے گی تو پتہ چلے گا کہ تم تو ولایتِ نار کے ماتحت تھے۔ تم ولیٔ نار ہو گئے ہو اور نار تمہاری ولی ہو گئی ہے۔ تم نے آگ جلائی اور آگ نے بھی تمہاری مدد کی تمہیں مشتعل کیا اور جلا ڈالا اس وقت تم متوجہ نہ تھے کہ

ولایتِ نار کے ماتحت ہو "وبئس المصیر"، جب کہ اللہ مومنین کا مولا ہے "نعم المولیٰ و نعم النصیر"، (وہ کتنا اچھا مولا ہے اور کتنا اچھا مددگار)۔ (انفال ۔۴۰)

اللہ تعالےٰ نے مختلف انداز سے ان دو مولا کا ذکر کیا ہے سورۂ مبارکہ حدید کی آیت ۱۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

"فالیوم لا یؤخذ منکم فدیۃ ولا من الذین کفروا مأوٰکم النار ھی مولٰکم و بئس المصیر"

(پس آج کے دن نہ تم سے اور نہ ہی ان سے جنہوں نے کفر اختیار کیا کوئی فدیہ لیا جائے گا تمہارا ٹھکانا آگ ہے وہی تمہاری مالک ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے)۔

تمہارے لیے بری تبدیلی آئی نار بری مصیر ہے "مصیر"، کا لفظی معنی ہے "ہونا" صیرورت یعنی "تم برے ہو گئے" خود تم آگ بن گئے۔ یہ "مصیر" ص سے ہے س سے نہیں کہ انسان گمان کرے کہ اس کی سیر یا سفر نار کی طرف ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ خود آتش ہو رہا ہے لہٰذا قرآنِ کریم کی بعض آیات اس طرح سے ہیں:

"فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝ نَارٌ حَامِيَةٌ" (قارعہ، ۹ تا ۱۱)

فرمایا کہ یہ لوگ اپنی ماں یعنی آگ کے تحتِ تدبیر ہیں جیسے ماں بچے کو غذا دیتی ہے اور اپنے دامن میں اس کو پالتی ہے۔ یہ بھی فرزندِ نار ہیں، ناران کی تدبیر کرتی ہے بعد کی گفتگو میں واضح ہوگا کہ بعض لوگ واقعاً تدبیرِ آتش کے ماتحت ہیں اور بعض واقعاً خدا تعالےٰ کی تدبیر کے ماتحت ہیں۔

حاصلِ سخن

پہلے مرحلے کی بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ ولاء چونکہ قرب کے معنی میں ہے

لہٰذا اگر کوئی موجود حق کے قریب ہوا تو آثارِ حق اس میں ظاہر ہوں گے اور اس کا حاصل محبتِ صادق اور نصرتِ صادق ہے اور اگر کوئی باطل کے نزدیک ہوا تو یہ ولاء باطل ہے اور اس کا حاصل محبت و نصرتِ باطل ہے۔ محبت و نصرتِ باطل کا معنی یہ ہے کہ اگر ظاہر میں محبت و نصرت ہے لیکن باطن میں عداوت و مخالفت ہے اور روزِ قیامت کہ جو حق و باطل کے مابین امتیاز کا مقام ہے، وہ درونِ باطل بیرونِ حق نما سے جدا ہو جائے گا،

" وامتازوا الیوم ایّھا المجرمون "

(اے مجرمو! آج کے دن جدا ہو جاؤ۔) یٰس - ۵۹

اس وقت یہ مجرم آتش میں داخل ہوں گے۔

والحمد للہ ربّ العالمین

○

درس ۴

یاد آوری:

ہمارا موضوعِ سخن قرآنِ کریم میں ولایتِ انسان ہے۔ درس ماقبل کہ جو ماہیت ولایت کے بارے میں ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ولاء کا معنی ہے قرب و نزدیکی اگر دو امر ایک دوسرے کے یوں نزدیک ہوں کہ ان کے مابین کوئی چیز فاصل نہ ہو تو کہتے ہیں کہ یہ باہم متوالی ہیں، انسانوں کی آپس میں ولایت سے مراد ان کی ایک دوسرے سے روحانی قربت ہے چاہے وہ خوب ہوں یا بد، مومنین باہم دیگر اولیاء ہیں اسی طرح منافقین بھی ایک دوسرے کے اولیاء ہیں۔ اگر معیار قربتِ الٰہی ہو تو یہ ولایت باطناً بھی ولایت ہو گی لیکن اگر معیار غیر الٰہی کی قربت ہو تو ظاہراً یہ ولایت قرب و محبت ہو گی اور باطناً عداوت و دشمنی لہٰذا اللہ تعالٰے فرماتا ہے:

"الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین"

اس روز دوست ایک دوسرے کے دشمن ہونگے مگر متقین۔ زخرف۔۶۷

کیونکہ اگر دوستی کا محور باطل ہو تو دوست ایک دوسرے کو برے کاموں کی تشویق کرتے ہیں لہٰذا درحقیقت وہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں البتہ یہ دشمنی دنیا میں مستور ہے اور قیامت میں آشکار ہو جائے گی کیونکہ وہ یومِ ظہورِ حق ہے یہی وجہ ہے کہ جہنم میں وہ ایک دوسرے سے لڑیں گے اور ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔

"کلما دخلت امۃ لعنت اختھا"

جب کوئی گروہ داخل ہو گا تو دوسرے پر لعنت کرے گا۔ الاعراف۔۳۸

اساسِ ولاء یہ ہے کہ انسان حق کے نزدیک ہو اور اس کے آثار سے بہرہ یاب ہو قرآنِ کریم میں اللہ تعالٰے نے ان آثار کی کہ جو محبت و نصرت سے عبارت

ہیں؛ اپنے اولیاء کو ضمانت دی ہے، کبھی قطعی صورت میں اور کبھی مشروط انداز میں؛ سورۂ آلِ عمران آیت ۳۱ میں ہے:

"ان کنتم تحبّون اللہ فاتّبعونی یحببکم اللہ"

اگر آپ محبِ خدا ہیں تو رسولؐ اللہ کے تابع ہو جائیں تاکہ اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے۔ یہ محبت کہ جو حاصلِ ولایت ہے اس کا مشروط طور پر وعدہ کیا جا رہا ہے یہی مفہوم قطعی پیرائے میں ایک اور آیت میں ذکر ہوا ہے:

"فسوف یأتی اللہ بقوم یحبّھم و یحبّونہ"

اللہ جلد ہی ایسی قوم کو لے آئیگا جس سے اللہ محبت کرتا ہوگا اور جو اللہ سے محبت کرتی ہوگی۔ مائدہ - ۵۴

فرماتا ہے کہ اگر کوئی گروہ دینِ حق کی نصرت نہ کرے تو اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا کہ جو محبوبانِ الٰہی ہیں اور اللہ بھی ان کا محبوب ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں پر قطعی انداز میں انہیں محبوبانِ الٰہی قرار دے رہا ہے نصرت کے بارے میں بھی اس سے ملتی جلتی تعبیر وارد ہوئی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

"ان تنصروا اللہ ینصرکم"

اگر تم نے اللہ کی نصرت کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ (محمد - ۷)

یہاں وعدۂ نصرت مشروط ہے اب سورۂ مومن کی آیت ۵۱ ملاحظہ کیجئے:

"انّا لننصر رسلنا والّذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدّنیا و یوم یقوم الاشھاد"

"ہم اپنے رسولوں اور مؤمنین کی یقیناً مدد کریں گے اس دنیا میں بھی اور اس روز بھی جس دن گواہی دینے والے اٹھیں گے"

یہاں پر وعدۂ نصرت قطعی ہے۔

یہاں تک پہلے مرحلے کے بارے میں کہ جو معنیٔ ولایت سے متعلق ہے کچھ مطالب بیان کیے گئے۔

ولایت کا وجودِ خارجی

ہمارا دوسرا موضوع بحث ہے " الولایۃ ھل ھی " کیا ولایت موجود ہے؟ ولایت جہانِ خارج میں یقیناً موجود ہے اگر جہانِ خارج میں وجودِ ولایت کے بارے میں ہمیں شک ہو تو اپنے نفس پر غور کرنے سے ہی ہم ہر طرح کا شک دور کر سکتے ہیں کیونکہ معرفتِ نفس تصورِ کائنات کے بہت سے مسائل کو حل کر دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے نفس کو ہمارے درونی امور اور قویٰ پر ولایت حاصل ہے نفس کے یہ شئون و امور کہ جن کا نفس سے ارتباط ہے تدبیرِ نفس کے ماتحت ہیں اور یہ تدبیرِ نفس تمام امور پر محیط ہے البتہ یہ ولایتِ تدبیری ہے کہ جس کی نسبت متخالفۃ الاطراف ہے، ایک ولی ہے اور دوسرا مولیٰ علیہ۔

انسان ولی اللہ

کیا ممکن ہے کہ انسان ولی اللہ ہو اور اللہ ولیِ انسان ہو اور اگر انسان کی ولایت اس کے اپنے شئونِ نفس کے بارے میں تقویت پا جائے تو کیا امورِ خارج پر بھی وہ ولایت حاصل کر لیتا ہے یا نہیں؟

اس ولایت کے ممکن ہونے پر عقلی دلیل موجود ہے اور اس کے وقوع پر دلیلِ قرآنی موجود ہے لہٰذا قرآن کی اس دلیل کے بعد ہمارے لیے امکان کی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی قرآنِ کریم خبر دیتا ہے کہ بعض لوگ اولیاءِ الٰہی ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ان کا ولی ہے:

"الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"

آگاہ رہیں کہ اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ کوئی حزن کرنے والے ہیں۔ یونس ۶۲

فرماتا ہے کہ بعض افراد اللہ کے ولی ہیں اور ان کی ولایت کا لازمہ یہ ہے کہ ان کے

پاس خوف و حزن کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اگر انسان اللہ کے نزدیک ہو تو وہ توحید کی پناہ گاہ اور قلعے میں ہوگا:

"لا الٰہ الا اللہ حصنی" [1]

لا الٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے اور اگر کوئی قلعۂ توحید میں ہو تو نہ اسے کوئی خوف ہے اور نہ حزن کیونکہ اس نے کچھ نہیں گنوایا کہ غمگین ہو اور نہ ہی کچھ گنوائے گا کہ ہراساں ہو کیونکہ اس قلعے میں کسی غیر کا نفوذ ممکن نہیں جو کچھ محبوبِ مومن ہے وہ کھو جانے والا نہیں اور جو کچھ کھو جانے والا ہے وہ اس کا محبوب نہیں لہٰذا کچھ اولیاء الٰہی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ بھی بعض کا ولی ہے "اللہ ولی الذین اٰمنوا" [2] اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ ولیٔ مومن ہے۔

ولایتِ الٰہی کی اقسام

اللہ تعالےٰ کی ولایت تین طرح کی ہے پہلی ولایت ولایتِ عام ہے کہ جو اللہ کی ربوبیتِ مطلقہ کے ساتھ ہے تمام موجودات اس کے دائرۂ کار میں ہیں مؤمنین، کفار بلکہ شیطان تک اس ولایت کے تحت ہیں شیطان اللہ کی مخلوق ہے اللہ تعالیٰ کے حضور وہ ذلیل ہے یہ ولایت کہ جو اللہ تعالےٰ کی ربوبیتِ مطلقہ کا نتیجہ ہے سب مخلوقات پر محیط ہے اور یہ محلِ بحث نہیں ہے دوسری ولایت وہ ولایتِ خاص ہے کہ جو اللہ تعالےٰ سب مومنین پر رکھتا ہے آیۃ الکرسی کا آغاز اسی ولایت کے بارے میں ہے تیسری اور بالاترین ولایت وہ خاص الخاص ولایت ہے کہ جس سے انبیاء اور اولیاء الٰہی مشرف ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے فرماتا ہے:

---

[1] توحید صدوق باب ثواب الموحدین حدیث ۲۱، ۲۳

[2] بقرۃ ۲۵۷

"ان ولیّیَ اللہ الذی نزّل الکتاب وھو یتولّی الصّالحین"

(میرا ولی وہ اللہ ہے کہ جس نے کتاب نازل کی اور وہ صالحین کا ولی ہے)۔

(الاعراف ۱۹۶)

یہ ولایت اللہ تعالٰے کی وہ خاص رحمت وعنایت ہے کہ جو انبیاء واولیاء کے لیے ہے دیگر مومنین کے لیے وہ یہ ولایت بروئے کار نہیں لاتا۔ ہماری گفتگو ولایتِ خاص کے بارے میں ہے اور انشاءاللہ ہم ولایتِ خاص الخاص کے بارے میں بھی بات کریں گے مختصر یہ کہ یہ آیاتِ قرآنی اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ مؤمنین بھی اولیاءِ الٰہی ہیں اور اللہ تعالٰے بھی مؤمنین کا ولی ہے۔ مؤمنین کی اللہ سے ولایت سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد، اخلاق اور اعمال اللہ تعالٰے کے اختیار میں دیتے ہیں اور اللہ کی مؤمنین سے ولایت سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی محبت، لطف اور نصرت مؤمنین پر نثار کرتا ہے اور نتیجۃً،

"یخرجھم من الظلمات الی النور"

(ان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے)۔

ولی اللہ کی پہچان کا طریقہ بھی اللہ تعالٰے نے اس آیت میں بتا دیا ہے ایک گروہ کے بارے میں فرماتا ہے،

"ان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس فتمنّوا الموت ان کنتم صادقین"

(اگر تمہیں یہ گمان ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر اللہ کے ولی ہو تو پھر اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔) (جمعہ-۶)

یعنی اگر تمہیں یہ زعم ہے کہ تم اولیاءِ الٰہی ہو تو پھر تمہیں چاہیئے کہ لقاءِ حق کے مشتاق بنو اور موت سے نہ ڈرو اگر تمہیں موت کی تمنا نہیں اور اس سے ہراساں ہو تو پھر جان لو کہ تم اللہ کے ولی نہیں ہو۔

تحقّقِ ولایت کے اسباب:

تیسرا موضوعِ سخن ہے "الولایۃ لِمَ ھی"؟ یعنی جو چیز روحِ انسانی میں ولایتِ الٰہی کے وجود میں آنے کا باعث بنتی ہے وہ کیا ہے؟ قرآنِ کریم اثباتِ ولایت کے راستوں کو نہ فقط استدلال کے ذریعے بیان کرتا ہے بلکہ وقوعِ خارجی کا ذکر بھی کرتا ہے۔

بات کے اثبات کے لیے جو دلیل ذکر ہوتی ہے وہ کبھی فقط اثبات کے لیے واسطہ ہوتی ہے اور کبھی ثبوت کے لیے بھی لیکن وجودِ آتش کو ثابت کرنے کے لیے دھوئیں کے موجود ہونے کا سہارا لیا جائے تو یہ فقط اثبات کا ذریعہ ہے ثبوت کا نہیں۔

قرآنِ کریم میں ولایت

ثبوت و اثبات میں واسطہ:

اللہ تعالےٰ ایسی دلیلیں پیش کرتا ہے جو ثبوت میں بھی واسطہ ہیں اور اثبات میں بھی ایسی راہیں ذکر کرتا ہے کہ اگر سالک ان پر چلے تو اللہ کے نزدیک ہو جائے اور قربِ الٰہی کے باعث خود بھی اللہ کا ولی بن جائے اور اللہ بھی اس کا ولی ہو جائے۔ سورۂ فاطر کی آیت ۶ میں فرمایا گیا ہے:

"انّ الشیطان لکم عدوٌ فاتخذوہ عدوًّا"

(یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے پس تم بھی اسے دشمن قرار دو)۔

یعنی جو تمہیں گناہ کی دعوت دیتا ہے تمہارا دشمن ہے اگرچہ وہ اپنے آپ کو دوست کے طور پر ظاہر کرتا ہے شیطان جنوں میں ہی سے مختص نہیں ہے بلکہ شیاطینِ جنّ بھی انسان کے دشمن ہیں اور شیاطینِ انس بھی، کیونکہ وہ انسان کو گناہ کی طرف دعوت دیتے ہیں جبکہ گناہ آگ ہے اور جو کوئی بھی انسان کو آگ کی طرف دعوت دے انسان کا دشمن

ہے اگرچہ دوست کے لبادے میں ہو۔ اسی سورت کی دسویں آیت میں ہے:

"من کان یرید العزّۃ فللہ العزّۃ جمیعًا"

(اگر آپ کو عزت کی خواہش ہو تو پھر عزت تو ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے)۔

اگر آپ عزیز ہونا چاہیں تو ضروری ہے کہ سرچشمۂ عزت کے قریب ہوں، مبدأ عزت کے قریب ہوں "ولیّ العزیز" ہو جائیں تاکہ آپ اس کی عزت سے بہرہ ور ہو سکیں۔

آیۂ کریمہ کا یہ معنی نہیں کہ "من کان یرید ان یعلم العزّۃ" یعنی اگر کوئی جاننا چاہے کہ عزت کہاں ہے تو جان لے کہ اللہ کے پاس ہے یہ بات فقط علمی ہے یعنی خبر کے طور پر بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی عزت کی جستجو میں ہے اور چاہتا ہے کہ عزیز ہو جائے تو جان لے کہ تمام تر عزت اللہ کے پاس ہے اور ذیل کی آیتِ کریمہ اس تک پہنچنے کے راستے کی راہنمائی کرتی ہے

"الیہ یصعد الکلم الطیّب والعمل الصّالح یرفعہ"

"کلامِ پاک اسکی طرف بلند ہوتا ہے اور عملِ صالح اسے بلند کرتا ہے" (فاطر، ۱۰)

اچھا عقیدہ اور نیک عمل حصولِ عزت کا ذریعہ ہیں اگر کسی کا عقیدہ طیب اور عمل صالح ہو تو وہ خدا کے نزدیک ہو جاتا ہے اور ولی اللہ بن جاتا ہے پھر اللہ بھی اس کا ولی ہے نتیجتًا اسے ہر تاریکی سے نجات عطا کرتا ہے اور اسے نورانی اور روشن کر دیتا ہے کیونکہ ولاءِ الٰہی کا یہ اثر ہے:

"یخرجھم من الظلمات الی النّور"

ولایت باطل

جو کچھ گزر چکا ہے وہ ولایتِ حق سے متعلق گفتگو تھی۔ ایک ولایتِ باطل بھی ہوتی ہے جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے اگر محورِ ولایت حق ہو تو ایسی ولایت کا

ظاہر و باطن ولایت و محبت ہے لیکن اگر محورِ ولایت باطل ہو تو ظاہرِ ولایت محبت ہے البتہ باطنِ ولایت عداوت و دشمنی ہے اور ولایتِ باطل کی راہ کو اس آیتِ مبارکہ میں بیان فرمایا ہے،

" والذین کفروا اولیاؤھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات "

(اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے اولیاء طاغوت ہیں جو انہیں نور سے نکال کر ظلمتوں میں لے جاتے ہیں۔) بقرہ ۲۵۷

اس منحوس ولایت کا نتیجہ سورۂ حدید کی آیت ۱۵ میں بیان فرماتا ہے:

" فالیوم لا یؤخذ منکم فدیۃ ولا من الذین کفروا ماؤکم النار ھی مولٰکم و بئس المصیر "

(آج تم سے نہ کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ کافروں سے۔ تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے وہی تمہارا رفیق ہے اور وہ (واقعی) برا ٹھکانا ہے۔)

اگر کوئی باطل کی طرف جائے تو درحقیقت وہ ولایتِ آتش کے ماتحت ہے، آتش ہی اس کا مولا ہے اور وہ ولیٔ نار ہے کیونکہ وہ گناہ سے محبت کرتا تھا اور شیطان بھی اسے محبتِ گناہ کی تشویق کرتا تھا۔

قرب و ولایت کا اتحاد نتیجہ کے اعتبار سے

ولایتِ حق و باطل کی وضاحت، ان تک پہنچنے کے طریقے اور ان دونوں کے نتائج کے بارے میں بحث کے بعد اب اس موضوع تک پہنچتے ہیں کہ تمام وہ آیات جو انسان کو خدا سے قریب کرنے والے اعمال کو بیان کرتی ہیں وہی ولایت کی مختلف راہوں کو بھی ثابت کرتی ہیں۔ ان سب میں سے جامع سورۂ مبارکہ اعراف کی آیت ۱۹۶ ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے بیان ہوئی ہے،

"ان ولیّیَ اللّٰہ الّذی نزّل الکتاب وھو یتولّی الصّالحین"

(یقیناً میرا ولی اللہ ہے کہ جس نے کتاب نازل کی اور وہ صالحین کا متولی ہے۔)

البتہ یہ ولایت خاص الخاص ہے کہ جو عام و متوسط مؤمنین کے لیے نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیاء الٰہی کے بارے میں ہے ارشاد ہے: بیشک میرا ولی وہ خدا ہے کہ جس نے قرآن کو نازل کیا ہے۔ یہاں حکم کا وصف پر معلق ہونا علیت کی نشاندہی کرتا ہے فرماتا ہے میرا ولی وہ خدا ہے کہ جس نے قرآن نازل کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ولایت کی راہ راہِ قرآن ہی ہے، اس کے بعد فرماتا ہے "وھو یتولّی الصّالحین" وہ خدا کہ جو صالحین کا متولی ہے یعنی میں قرآن اور حبل اللہ سے تمسک کی وجہ سے صالح ہو گیا اور جو صالح ہوا وہ خدا کی ولایت کے ماتحت ہے۔

دو صغریٰ و کبریٰ کو آپ نے اس جملہ میں بیان کیا ہے ایک یہ کہ قرآن کو اللہ نے بھیجا ہے جس نے بھی اسے پالیا وہ صالح ہو گیا۔ میں نے قرآن کو پالیا ہے لہٰذا میں صالح ہو گیا ہوں۔ دوسرا یہ کہ جو کوئی بھی صالح ہو جائے وہ ولایت الٰہی کے ماتحت ہے۔ میں صالح ہو گیا ہوں لہٰذا ولایتِ الٰہی کے ماتحت ہوں۔

قبل کی گفتگو سے بھی یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اللہ نے اپنے پاس سے اس قرآن کو اتارا اور آویزاں کیا ہے نہ یہ کہ پھینک دیا اور ڈال دیا ہے قرآن کی ایک طرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف رسی کی صورت میں آویزاں ہے اور وہ ہم سے فرماتا ہے کہ اس رسی کو پکڑ کر اوپر کو آجائیں:

"واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعًا"۔ (آل عمران: ۱۰۳)

یہ دو اصول کہ جن سے دو قیاسِ منطقی[1] تشکیل پاتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] اصطلاحی اعتبار سے قیاس دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ قیاس جو علم اصول وفقہ کی اصطلاح ہے اور جو کسی یقینی نتیجے پر منتج نہیں ہوتا اور دوسرا جو علم منطق کی اصطلاح ہے جس کے دونوں مقدمے یقینی ہوتے ہیں اور ان کی درست علمی ترتیب سے حاصل ہونیوالا نتیجہ بھی یقینی ہوتا ہے۔ (مترجم)

سے مختص نہیں ہیں۔ راہ سب کے لیے کھلی ہے البتہ جو کوئی بھی اس راستے کو بہتر طور پر طے کرے گا زیادہ فائدہ اٹھائے گا۔ قرآن سب کے لیے آیا ہے اور سب کی دسترس میں ہے جو کوئی بھی بھلائی کا راستہ جس قدر طے کرے گا اسی قدر ولاءِ الٰہی سے بہرہ مند ہوگا تاہم بلند ترین درجہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختص ہے صالح اور عملِ صالح انجام دینے والے میں فرق ہے ایک اور نکتہ کہ جس کا ذکر مفید ہے یہ ہے کہ صالحین اور "الذین یعملون الصالحات" میں فرق ہے صلاح کا ایک مرتبہ فقط انجام میں ہے لیکن اس کا بالاتر مرتبہ مقامِ ذات میں صلاح کا ہے جو ابتداءِ راہ میں ہیں اور اچھے کام انجام دیتے ہیں وہ — "الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات" میں سے ہیں لیکن جو اختتامِ راہ پر ہیں اور ایمان و عملِ صالح ان کا ملکہ[1] ہوگیا ہے اور وہ صلاحِ عمل کے مقام سے صلاحِ ذات تک جا پہنچے ہیں وہ صالحین میں سے ہیں کہ جن کی ذات سے کارِ خیر کے علاوہ کوئی چیز صادر ہی نہیں ہوتی۔ جو لوگ ایمان اور عملِ صالح کی حد میں ہیں وہ اسی محدود پیمانے پر ولاءِ الٰہی سے بہرہ مند ہیں لیکن جو مقامِ صالحین تک پہنچ گئے ہیں وہ کامل تر ولاء کے حامل ہیں لہٰذا "اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور" سب کے لیے یکساں نہیں بعض کے لیے یہ دفع کی حیثیت رکھتی ہے اور بعض کی رفع۔ جو لوگ ابھی شروع امر پر ہیں اللہ تعالےٰ ان سے ظلمت کو رفع کرتا ہے یعنی ان سے تاریکیوں اور تباہیوں کو دور کرتا ہے تاکہ وہ خالص ہو جائیں لیکن جو لوگ راستہ طے کر کے آخر تک آ پہنچے ہیں ان کے لیے اللہ تعالےٰ کی ولاء کا نتیجہ دفعِ ظلمات ہے یعنی اللہ انہیں آلودہ نہیں ہونے دیتا نہ یہ کہ آلودگی کے بعد ان کی تطہیر کرتا ہے جیسا کہ آیۂ تطہیر میں ہے:

---

[1] استمرارِ عمل سے کسی چیز کی صلاحیت کسی شخص میں اس طرح سے پیدا ہو جائے کہ وہ اس کا معمولِ حیات اور فطرتِ ثانیہ بن جائے تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص میں اس چیز کا ملکہ پیدا ہوگیا ہے۔ (مترجم)

"انّما یرید اللہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت و یطھّرکم تطھیرًا"

اللہ کا حتمی ارادہ ہے کہ اہل بیت سے رجس و ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں یوں پاک رکھے کہ جیسا پاک رکھنے کا حق ہے۔ (سورۂ احزاب - ۳۳)

یہ اذہاب و دُوری رجس اور تطہیر دونوں سے یہاں دفع مراد ہے نہ کہ رفع یعنی اللہ اجازت نہیں دیتا کہ شیطان تمہاری طرف آئے اور تمہیں آلودہ کرے نہ یہ کہ آلودگی کے بعد وہ تمہاری تطہیر کرتا ہے۔

ولایت کی اقسام کے بارے میں ولایتِ تکوینی و تشریعی کی تقسیم کے حوالے سے انشاء اللہ ہم گفتگو کریں گے۔ ترتیبِ بحث کے لحاظ سے ہم اس مرحلے پر نہیں پہنچے کہ تکوین و تشریع پر بحث کریں۔ ابھی گفتگو اس بارے میں ہے کہ انسان محبت و نصرت کی حد تک ولیِ خدا ہو جائے اور اسی حد تک اللہ تعالےٰ اس کا ولی ہو جائے اور اس کا راستہ کلمِ طیّب اور عملِ صالح ہی ہے۔

"والحمد للہ ربّ العالمین"

○

درس ۵

ہماری گفتگو قرآن کریم میں ولایتِ انسان کے بارے میں جاری ہے اس کی منطقی ترتیب یہ ہے: پہلے "الولایۃ ماھی" ولایت کیا ہے اور پھر "الولایۃ ھل ھی؟" یعنی کیا ولایت موجود بھی ہے یا نہیں اور تیسرے مرحلے پر "الولایۃ لم ھی؟" یعنی اثباتِ ولایت کا راستہ کیا ہے اور آخر میں "الولایۃ کم ھی؟" یعنی ولایت کی اقسام کیا ہیں؟

ولایت و موالات

پہلی فصل کا خلاصہ یہ ہے کہ ولایت "ولی" سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے قرب اور نزدیکی، اور اگر کوئی اللہ کے نزدیک ہو جائے تو اس قربت کو ولایت کہتے ہیں اور اس کا نتیجہ ہے نصرت، محبت وغیرہ۔

یہ جو انسان اللہ کے نزدیک ہوتا ہے اور ولایتِ الٰہی کو قبول کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے آپ میں جس ذلت کا احساس کرتا ہے اسے قربِ خدائے عزیز کے زیرِ سایہ دور کرنا چاہتا ہے لیکن انسان کے لیے خدا کی طرف سے ولایت و قربت کی وجہ اس ذاتِ مقدس میں احساس ذلت نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کا مقصد ان بندوں کی تربیت و پرورش ہے کہ جن کی ولایت اس نے اپنے ذمہ لی ہے لہٰذا اللہ تعالےٰ اور بندوں کے مابین جو ولایت ہے وہ اس ولایت سے مختلف ہے جو انسانوں کے مابین موجود ہے، کیونکہ انسانوں کے مابین مروج ولایت میں طرفینِ ولاء ایک جیسے ہوتے ہیں سورۂ توبہ کی آیت ۷۱ میں ہے:

"والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر"

(مؤمنین اور مؤمنات ایک دوسرے کے ولی ہیں جو اچھائی کی دعوت دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں)۔

مؤمنین کے درمیان ولایت ولائے متقابل یا موالات ہے اور اس کا نتیجہ بھی یکساں اور متقابل ہوتا ہے اس معنی میں کہ وہ ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں لہٰذا ایک دوسرے کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں، ایک دوسرے کو نصیحت و ہدایت کرتے ہیں جہاں ضرورت ہو تعاون کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد و نصرت سے دریغ نہیں کرتے۔

تاہم وہ ولایت کہ جو انسانوں اور خدائے سبحان کے درمیان موجود ہے اگرچہ ظاہری طور پر اس کا اطلاق جس طرح خدائے سبحان کا انسان کے ساتھ رابطے پر ہوتا ہے اسی طرح انسان کے حضرتِ حق سے رابطے پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ولایت کی موالات اور دو طرفہ روابط کی طرف بازگشت یکساں نہیں ہے بلکہ اس رابطۂ ولائی میں اللہ تعالےٰ کا ولی ہونا "والی" کے معنی میں ہے اور بندہ "مولٰی علیہ[1]" ہے۔ خداوندِ متعال کی ولایت کا سبب احساسِ ذلت نہیں ہے[2] لم یکن لہ ولی من الذل بلکہ بڑی بات بندوں کی تو ذلت و فقر کے سوا اس غنیٔ محض سے انکی کوئی اور نسبت ہی نہیں، جیسا کہ سورۂ فاطر کی آیت ۱۵ میں ہے،

"یا ایہا النّاس انتم الفقراء الی اللّٰہ"

اے انسانو! تم اللہ کے حضور فقیر ہو۔

سب "ذلّ الی اللّٰہ" (اللہ کے سامنے ذلیل و فقیر) کے مقام پر ہیں۔ سب اللہ کے محتاج ہیں لیکن وہ سبحان ذات بے نیاز ہے لہٰذا خدا کو کسی سے ذل و ذلت کی نسبت نہیں ہے نتیجتاً اللہ تعالےٰ اور مومنین کے مابین ولایت کی نسبت

---

[1] مولٰی علیہ یعنی جس پر ولایت نافذ ہے۔

[2] بنی اسرائیل ۱۱۱

متخالفۃ الاطراف ہے جیسے علت و معلول کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف انسانوں کے مابین نسبتِ ولایت متوافقۃ الاطراف ہے۔

دوسری فصل کا خلاصہ یہ ہے کہ ولایت موجود ہے کیونکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بعض لوگ اولیاء خدا ہیں۔

تاثیرِ عمل

بحث کی تیسری فصل میں ہم نے کہا کہ ہر وہ عمل جو انسان کو خدا سے قریب کرتا ہے اثباتِ ولایت کا ذریعہ ہے کیونکہ اگر لفظی بحث ہو تو ممکن ہے کہا جائے کہ ولایت اور ہے اور تقرب اور لیکن بحث معنوی ہے لہٰذا چاہے لفظِ ولایت زیرِ بحث آئے یا لفظِ تقرب، دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔ ہر عملِ صالح کہ جو انسان اللہ کے لیے انجام دیتا ہے یعنی جو حسنِ فعلی بھی رکھتا ہے اور حسنِ فاعلی بھی، اسے اللہ کے قریب کرتا ہے اور جب وہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے تو ولایتِ الٰہی کے تحت آ جاتا ہے لہٰذا وہ سب آیات جو تقرب کی دعوت دیتی ہیں آیاتِ ولاء ہیں اور ان آیات کے مضمون پر عمل درآمد انسان کو اللہ کے قریب کرتا ہے اور باعث بنتا ہے کہ انسان اللہ کی ولایت، تدبیر اور سرپرستی سے بہرہ مند ہو البتہ جو کوئی بھی اس راستے کو بہتر طے کرے گا وہ بہتر مستفید ہوگا۔ جو کوئی بھی تقرب کے راستوں کو پوری طرح سے پہچان کر طے کرے گا قرآن کریم کی اصطلاح میں وہ مقربین میں شمار ہوگا اور اللہ تعالٰی اسے اپنا محرمِ راز بنا لے گا۔

فرماتا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کلیم کو اپنے نزدیک کر کے اس سے مناجات کی "وقربناہ نجیا"[1]۔ "نجی" یعنی جس سے مناجات کی جائے۔ مناجات ایسی

---

[1] مریم - ۵۲

آرام سے کی جانے والی گفتگو کو کہتے ہیں کہ جو کسی انسان سے قربت کی وجہ سے کی جائے۔

جو دور ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کو صدا کرتے ہیں۔ وہ بھی اللہ کو آواز دیتے ہیں اور اللہ بھی انہیں پکارتا ہے جو مومنین دور ہوتے ہیں اللہ تعالےٰ انہیں خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے " یا ایہا الذین اٰمنوا " جو لوگ زیادہ دور ہیں وہ اللہ تعالےٰ کے اس بلا واسطہ خطاب سے محروم ہیں ان کے لیئے اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واسطہ قرار دے کر آنحضرت سے فرماتا ہے ان سے کہہ دے مثلاً۔
" قل للذین اوتوا الکتاب [1] یا " قل یا اھل الکتاب [2] جو لوگ ان سے بھی دور تر ہیں انہیں " یا ایہا الناس " کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اور آخر کار ایک گروہ وہ بھی ہے کہ:

" لا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم "

(اللہ ان سے کلام بھی نہیں کرتا اور نہ ان کی طرف دیکھتا ہے۔)

(آلِ عمران۔ ۷۷)

ان کے بالمقابل جو لوگ اللہ سے بہت نزدیک ہیں اللہ انہیں اپنے آپ سے مربوط جانتا ہے اور ان سے مناجات کرتا ہے حضرت عیسیٰ سلام اللہ علیہ کے بارے میں آیا ہے:

" وجیھا فی الدنیا والاٰخرۃ ومن المقربین "

(وہ دنیا و آخرت میں باوجاہت و باوقار ہیں اور مقربین میں سے ہیں)۔

(آلِ عمران۔ ۴۵)

ایک اور گروہ کے بارے میں بطور عموم آیا ہے کہ وہ مقربین میں سے ہے۔

---

[1] آلِ عمران ۔ ۲۰

[2] آلِ عمران ۶۴ وغیرہ

ولایت، آیات کی روشنی میں

اب ہم ولایت کے بارے میں آیات کا تذکرہ کریں گے چاہے وہ کسی کے لیے ولایت ثابت کرتی ہوں یا سلب کرتی ہوں اسی طرح تقرب سے متعلق آیات پر بھی گفتگو ہوگی۔

سورۂ مبارکہ مائدہ کہ جس کی بہت سی آیات ولایت سے مربوط ہیں میں ولایتِ امیر المؤمنین کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے:

"یا ایّھا الّذین اٰمنوا لا تتخذوا الّذین اتخذوا دینکم ھزوًا و لعبًا من الّذین اوتوا الکتاب من قبلکم و الکفّار اولیاء"

(اے ایمان والو! تم سے پہلے جنہیں کتاب دی گئی ہے اور کافروں میں سے جنہوں نے تمہارے دین کو تمسخر اور کھیل بنا رکھا ہے انہیں اپنا ولی نہ بناؤ)۔

(مائدہ - ۵۷)

واضح ہے کہ اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ واقعًا دنیا میں دو راستے ہیں ایک حق اور دوسرا باطل کیونکہ باطل راستہ نہیں بلکہ بے راہ روی ہے راستہ تو وہ ہے کہ جس کا کوئی اختتام اور منزل ہو جو انسان گناہ کی طرف چلتا ہے وہ بے راہ روی کا شکار ہے لہٰذا ایسے افراد کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"یوم لا یغنی مولًی عن مولًی شیئًا"

(جس دن کوئی دوست کسی دوست کے ذرا بھی کام نہ آئے گا۔)

(دخان - ۴۱)

جو دنیا میں ایک دوسرے کے ولی تھے قیامت میں وہ کچھ نہ کر پائیں گے "مولیٰ" سے یہاں متصف کرنا "ما کان" (جو تھا) کے تعلق سے ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ لوگ قیامت میں ایک دوسرے کے ولی ہیں لیکن کر کچھ نہیں پاتے کیونکہ اس دن "تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ" [1] (ان کے اسباب و وسائل منقطع ہو جائیں گے)

---

[1] بقرہ - ۱۶۶

اور "لا انساب بینھم"[1] ان کے درمیان نسب اور رشتہ داری نہیں رہے گی) سب علل واسباب منقطع ہو جائیں گے کوئی ولاء ان کے مابین نہ ہوگی مقصود یہ ہے کہ جو دنیا میں ایک دوسرے کے اولیاء تھے قیامت میں ان سے کچھ نہ بن پائے گا۔ مثلاً یہ آیۂ کریمہ ملاحظہ ہو:

"یوم یفرّ المرء من اخیہ و امّہ و ابیہ"

(اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھی بھاگے گا اور ماں باپ سے بھی)۔

(عبس - ۳۴-۳۵)

اس سے دنیاوی بھائی اور ماں باپ مراد ہیں نہ کہ قیامت میں کوئی بیٹے یا باپ کا رشتہ ہوگا وہاں سب خاک سے اٹھائے جائیں گے اور ایک دوسرے سے گریزاں ہوں گے:

"فاذا ھم من الاجداث الیٰ ربّھم ینسلون"

(تو وہ اپنی قبروں سے اپنے رب کی طرف چل دیں گے۔) (یٰس-۵۱)

ولایت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے:

"یوم لایغنی مولیً عن مولیً شیئاً"،

کیونکہ سورۂ مبارکہ حدید آیت ۱۵ میں کافروں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"ماْوٰکم النار ھی مولٰکم"

تمہارا بس ایک ہی مولا ہے اور وہ آگ ہے اور بعض اوقات فرماتا ہے آگ ان کی ماں ہے:

"فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ"[2] جیسے ماں بچے کو پالتی ہے اور اسے غذا مہیا کرتی ہے آگ بھی انہیں پالتی ہے کیونکہ یہ آگ کے تحت تدبیرِ حرکت کرتے ہیں لہٰذا ان کا مولا آگ ہے۔

---

[1] مؤمنون - ۱۰۱ [2] قارعۃ - ۹

سورۂ مبارکہ مائدہ میں اولیاء بنانے کے بارے میں یوں فرمایا گیا ہے:

"ولو کانوا یؤمنون باللہ والنبیّ و ما انزل الیہ ما اتخذوھم اولیاء و لکنّ کثیرًا منھم فاسقون"

(اگر وہ اللہ پر اور نبی پر، اور جو کچھ اس پر نازل کیا گیا ہے ایمان لے آتے تو ان (انکار کرنے والوں) کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر بدکار ہیں)

(مائدہ - ۸۱)

قیاس استثنائی[۱] کی صورت میں فرماتا ہے اگر یہ مومن ہوتے تو غیرِ خدا کو ولی نہ بناتے لیکن تالی باطل ہے لہٰذا مقدم بھی باطل ہے[۲] پس وہ مومن نہیں۔ مقدم و تالی کے درمیان ملازمہ اور لازمی تعلق یہ ہے کہ اگر کوئی مؤمن ہے تو وہ اللہ کے نزدیک ہے اور باطل سے دور ہے اور جو کوئی باطل سے دور ہے وہ باطل کو اپنا سرپرست نہیں بناتا اور ولایتِ باطل کو قبول نہیں کرتا۔ قرآن کریم میں جب اقتدارِ شیطان کے بارے میں بات کی گئی ہے تو فرمایا گیا ہے کہ شیطان کا اقتدار اسی پر ہوتا ہے جو اس کا اقتدار قبول کرتا ہے:

"اِنَّمَا سُلْطَانُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ" (نحل - ۱۰۰)

متولی یعنی ولایت کو قبول کرنے والا۔

سورۂ مبارکہ انفال کی آیت ۷۲ میں مومنین کی باہمی موالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"انّ الذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین اٰووا ونصروا اولٰئک بعضھم اولیاء بعض والذین

---

[۱] ایک اعتبار سے قیاس منطق کی دو قسمیں ہیں ایک قیاسِ اقترانی اور دوسری قیاسِ استثنائی۔ (مترجم)

[۲] یعنی پہلا مقدمہ غلط ہے تو دوسرا بھی غلط ہوگیا یعنی چونکہ وہ مومن نہیں ہیں لہٰذا انہوں نے غیرِ خدا کو ولی بنالیا ہے۔ (مترجم)

اٰمنوا ولم یہاجروا مالکم من ولایتھم من شیء ''۔

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں (مدینہ میں) پناہ دی اور ان کی مدد کی وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور وہ جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی پس تمہارے ذمہ ذرا بھی ان کی سرپرستی نہیں)۔

یہ جو کہا جاتا ہے "ولایت" محبت و نصرت کے معنی میں ہے اور "ولایت" سرپرستی و تدبیر کے معنی میں ہے، ہر جگہ صحیح نہیں کیونکہ اسی آیت میں جو ولایت آیا ہے موالات اور محبت و نصرت کے معنی میں ہے جبکہ " ھنالک الولایۃ للہ الحق" میں سرپرستی و تدبیر کے معنی میں ہے یعنی جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت نہیں کی تمہاری ولایت میں ان کا کوئی حصہ نہیں اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

" والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر "

(اور وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اگر تم ایسا نہ کروگے (آپس میں دوست نہ بنوگے) تو روئے زمین پر بہت بڑا فتنہ و فساد برپا ہوگا۔) (انفال ۔ ۷۳)

سورۂ مبارکہ توبہ کی آیت ۲۳ میں فرماتا ہے:

" یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا آباءکم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان "

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے آباء اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔)

رشتہ داری کا کوئی بھی تعلق اسی وقت محترم ہے کہ جب وہ حدود الٰہی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال محکمات میں سے ایک قول

سورۂ کہف ۔ ۴۴

یہ ہے کہ:

" لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق " (من لایحضرہ الفقیہ۔ ج ۴ ص ۳۷۲)

(اللہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی)۔

یہ بات تمام دیگر عناوین پر حاوی ہے یعنی دوسروں کی اطاعت وہاں پر ہے کہ جہاں باعثِ گناہ نہ ہو۔ دوسروں کی ولایت بھی ایسے ہی ہے۔ ولایتِ اخوت، باپ کی ولایت اور مؤمنین کے درمیان ولایت کی شرط بھی یہی ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کا باعث نہ ہو۔ لہٰذا اس آیۂ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہارے قریبیوں میں سے کوئی کافر ہو جائے تو پھر تمہارے اور اس کے مابین تبرّا ہے، تولّا نہیں۔ " ومن یتولہم منکم فاولئک ھم الظالمون " اگر تم میں سے کسی نے ایسوں سے تولّا اختیار کیا تو وہ ظالم ہے اس سے بعد کی آیت میں بھی انہیں تہدید فرمائی گئی ہے۔

اسی طرح اسی سورۂ مبارکہ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے:

" ومن الاعراب من یتخذ ما ینفق مغرمًا "

بعض بادیہ نشین انفاق فی سبیل اللہ کو تاوان سمجھتے ہیں۔ (توبہ۔ ۹۸)

" ویتربص بکم الدوائر علیہم دائرۃ السوء واللہ سمیع علیم ومن الاعراب من یؤمن باللہ والیوم الاٰخر ویتخذ ما ینفق قربات عند اللہ وصلوات الرسول "

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض ایسے ہیں کہ جو انفاق کو باعثِ تقرب اور صلواتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذریعہ سمجھتے ہیں لہٰذا وہ انفاق کرتے ہیں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پر صلوات بھیجیں اور صلواتِ پیغمبرؐ سے مراد ان کی دعا اور طلبِ رحمت ہے کہ جو مؤمنین کے لیے سکون و آرام کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا وصل علیہم ان صلوٰتک سکن لہم "

(ان کے اموال میں سے صدقہ قبول کر کے اس (صدقہ) سے ان کو پاک کر اور ان کا تزکیہ کر اور ان کے لیے دعاء خیر کر، بیشک تیری دعا ان کے لیئے باعثِ تسکین ہوگی) (توبہ - ۱۰۳)

پھر قرآن ایسے لوگوں کی تائید کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"ألا انها قربة لهم"

ہاں یقیناً یہ انفاق ان کے لیئے تقرب کا ذریعہ اور دعاء رسول (ص) کا وسیلہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰے انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا:

"سيدخلهم الله في رحمته ، ان الله غفور رحيم"

(اللہ انہیں جلد اپنی رحمت میں داخل کرے گا تحقیق اللہ غفور الرحیم ہے)

(توبہ - ۹۹)

سورۂ مبارکۂ رعد کی آیت ۱۱ میں فقط مومنین کے والی و سرپرست ہونے کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم واذا اراد الله بقوم سوءاً فلا مرد له وما لهم من دونه من وال"

(بیشک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں اور جب اللہ کسی قوم کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کوئی ٹالنے والا نہیں پھر اس کے سوا اس کا کوئی مددگار نہیں۔)

انسان بالضرورت محتاج ہے اور بالضرورت اسے غیر خدا کی حاجت نہیں ہے، ان دو قضیۂ ضروریہ کی بنیاد پر کہ جنہیں اس آیہ شریفہ میں بھی واضح کیا گیا ہے:

"يا ايها الناس انتم الفقراء الى الله"

(اے انسانو! تم اللہ کے محتاج ہو۔) (فاطر - ۱۵)

سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ انسان کے لئے اللہ تعالٰے کے علاوہ کوئی والی و سرپرست تصور نہیں کیا جاسکتا لہٰذا فرمایا گیا ہے:

"مالهم من دونه من وال"

(ان کے لیئے اس کے علاوہ کوئی ولی و سرپرست نہیں۔)

سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیہ اس نکتے کو بیان کرتی ہے کہ ولایتِ الٰہی اس کی طرف سے سرپرستی کے معنی میں ہے اور یہ ایک متخالفۃ الاطراف نسبت ہے۔ فرماتا ہے۔

"وقل الحمد لله"

حمد جہاں بھی ہے اللہ سے مختص ہے کیونکہ غیرِ خدا والی ہی نہیں کہ کسی چیز کا حامل ہو، عطا کرے اور مستحقِ حمد قرار پائے "الذی لم یتخذ ولدًا ولم یکن له شریك فی الملك"[1] یعنی اس کی کوئی اولاد اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ "ولم یکن له ولی من الذل" اس کا ولی ہے لیکن اس کا کسی کو ولی بنانا ذلت کی وجہ سے نہیں لیکن دوسرے چونکہ ذلیل ہیں اس لیے ان کا ولی ہے جب کہ خداوندِ عزیز کا کوئی "ولی من الذل" نہیں ہے اس کے ہاں ذلت کی گنجائش ہی نہیں کہ اسے ولی کی ضرورت ہو۔ "وکبره تکبیرًا" یعنی اسے بزرگ جان۔ اللہ اکبر کہنا ایک لفظی تکبیر و عبادت ہے لیکن اگر انسان اللہ کی کبریائی کو پہچان لے تو غیرِ خدا کا اس کی نظر میں کوئی جلوہ ہی نہ ہوگا۔ ممکن نہیں کہ انسان اللہ کو بڑا جانے اور آسمان و زمین کو بھی، امیر المومنین علیہ السلام خطبۂ ہمام میں متقین کے بارے میں فرماتے ہیں:

"عظم الخالق فی انفسهم فصغر ما دونه فی اعینهم"

"اللہ کی عظمت ان کی روحوں میں ایسی سمائی کہ ہر دوسری چیز ان کی نظروں میں چھوٹی ہوگئی"

یعنی عظمتِ خدا کا ادراک دوسروں کی تصغیر و تحقیر کے ساتھ ساتھ ہے جب

---

[1] اس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ ہی ملک و اقتدار میں اس کا کوئی شریک ہے۔

انسان اللہ کو عظیم جان لے دوسرا جو کوئی اور جو کچھ بھی ہے اس سے کہیں چھوٹا ہے کہ انسان اسے ولی بنالے، اور اس سے عزت، قدرت اور دیگر کمالات حاصل کرنے کی جستجو کرے لہٰذا اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"ایبتغون عندھم العزۃ"

یعنی یہ لوگ حصولِ عزت کے لیے غیرِ خدا کے پیچھے ہیں۔ (نساء۔ ۱۳۹)

جبکہ:

"فللہ العزۃ جمیعًا" (فاطر۔ ۱۰)

اگر تمام تر عزت خدا ہی کے لیے ہے تو پھر حصولِ عزت اور رفعِ ذلت کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ اس کی ولایت کو قبول کرلیا جائے لہٰذا فرماتا ہے "فاللہ ھو الولیّ" اس کا لہجہ اس آیۂ شریفہ کی طرح کا ہے "ذلک بانّ اللہ ھو الحقّ" یہ اندازِ حصر کا ہے ضمیرِ فصل "ھو" آئی ہے اور ساتھ خبرِ معرفہ ہے کہ جو مفیدِ حصر ہے، یعنی اللہ کو چھوڑ دیا تو سب کچھ باطل ہے زیرِ بحث آیت میں مراد یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی ولی نہیں۔ سورۂ رعد کی آیت ۱۱ میں ہے:

"واذا اراد اللہ بقوم سوءًا فلا مردّ لہ ومالھم من دونہ من وال"

(جب اللہ کسی قوم کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کوئی ٹالنے والا نہیں پھر اس کے سوا اس کا کوئی مددگار نہیں)

اور سورۂ کہف کی آیہ ۱۷ میں ہے:

"ومن یضلل فلن تجد لہ ولیًّا مرشدًا"

(اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو اس کے لیے ہرگز کوئی سرپرست و ہادی نہیں پائے گا)۔

"اگر اللہ تعالےٰ کسی کو گمراہ کردے" سے مراد یہ ہے کہ اسے فیضِ ہدایت سے محروم کردے تو پھر ممکن نہیں کہ کوئی اسے ہدایت کرسکے سورۂ رعد کی آیت فعلِ خدا میں ولایت کے بارے میں ہے اور سورۂ کہف کی آیت اس کے علم میں ولایت

سے متعلق ہے ان دونوں آیتوں سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسائل علمی ہوں یا عملی انسانوں کا واحد والی و سرپرست اللہ تعالےٰ ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی آیت اللہ تعالےٰ کے لیے ولایتِ مطلقہ ثابت نہیں کرتی بلکہ سورۂ کہف کی آیت کا موضوع خاص طور پر ہدایت میں ولایتِ الٰہی ہے۔ جبکہ سورۂ رعد کی آیت خاص طور پر رفعِ عذاب میں ولایتِ الٰہی کا ذکر کرتی ہے لیکن سورۂ شوریٰ کی آیہ ـــــ فاللہ ھو الولیّ ، اسس کی ولایتِ مطلقہ کی طرف متوجہ کرتی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک اس ولایتِ جامعہ کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا دوسروں سے حاصل ہونے والی ولایتیں بھی ولایتِ الٰہی کا پرتو ہیں پس بندوں کی طرف سے محبت و نصرت دکھائی دے تو دراصل وہ محبت و نصرتِ خدا ہے اور وہ بندے وسیلے سے زیادہ کچھ نہیں۔

حاصلِ سخن

اب تک کی جانے والی بحث کا خلاصہ یہ ہے:

① اللہ اور بندوں کے درمیان یک جانبہ ہے یعنی درحقیقت ولایت اللہ کی ہے اور انسان مولّیٰ علیہ ہے۔ اللہ ہی والی و ولی ہے۔

② ہر عملِ قربت باعثِ ولایت ہے۔

③ جس عمل کا قرب زیادہ ہوگا حصولِ ولایت اس سے زیادہ ہوگا۔

④ جو کوئی اللہ کا ولی ہے وہ ظلمات سے نکل کر نور کی راہ پائے گا یا معصومینؑ کی طرح دفعاً یا دوسرے انسانوں کی طرح رفعاً[1]

⑤ اعمالِ صالح کو "لوجہ اللہ" بجا لانا اس طرح سے کہ حسنِ فعل اور حسنِ فاعلی

---

[1] یعنی معصومین ہوتے ہی نور میں ہیں ظلمت اُن کے قریب بھی نہیں پھٹکتی اور دوسرے لوگ ولایتِ الٰہی کے زیرِ سایہ ظلمات سے نکل کر نور کی طرف آجاتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ (مترجم)

دونوں کو ملحوظ رکھا جائے) کہ جو اس چیز کی علامت ہے کہ انسان اللہ کی ولایت کے ماتحت ہے لیکن اگر انسان اعمالِ قربت کی بجاآوری سے محروم ہو جیسے انفاق کو تاوان سمجھنے والا یا اعمالِ قربت کو غیرِ خدا کے لئے بجا لانے والا تو جان لے کہ وہ ولایتِ شیطان کے ماتحت ہے۔

والحمد للہ رب العالمین

○

درس ۶

یادآوری :

ہماری گفتگو قرآنِ کریم میں ولایت کے بارے میں ہے فصلِ سوم کہ جو طریقِ اثباتِ ولایت کے بارے میں تھی اس سے یہ بات روشن ہوگئی کہ ہر وہ عمل کہ جو انسان کو اللہ کے نزدیک کرتا ہے اثباتِ ولایت کا ذریعہ ہے چونکہ بحث معنوی ہے لہٰذا جس چیز سے بھی مفہوماً تقرب اور نزدیکی کا استفادہ ہو وہ اس بحث کی حدود میں داخل ہوگی چاہے وہ لفظِ ولایت کے ساتھ ہو یا قرب اور دُنُوّ وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ نے عبادات کو چونکہ تقرب کا ذریعہ قرار دیا ہے لہٰذا حصولِ ولایت اور ولایت کے وجودِ خارجی کے اثبات کے لیے بہترین ذریعہ قصدِ قربت سے اعمالِ قربت کی بجاآوری ہے اس میں حسنِ فعلی بھی پایا جاتا ہے اور حسنِ فاعلی بھی جب کہ حرام اور مکروہ جیسے بُرے اعمال کی انجام دہی یا کسی کو دکھانے اور سنانے کے لیے اعمالِ قربت کی بجاآوری ولایت کے وجود پذیر ہونے میں مانع ہے۔

محبتِ دنیا بھی ایک رکاوٹ ہے

اللہ تعالےٰ جب تقرب کے اہم ترین راستے کا ذکر کرتا ہے تو "کلم طیب" کہ جو توحید ہی ہے کو عملِ صالح کی تقویت کے ساتھ تقربِ الٰہی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ"

(اسی کی طرف پاکیزہ کلمات بلند ہوتے ہیں اور وہ نیک اعمال کو رفعت عطا کرتا ہے۔) فاطر - ۱۰

اس کے برخلاف عالمِ طبیعت اور عالمِ خاک کی طرف میلان کو راہِ ولایت کی عظیم رکاوٹوں میں شمار کرتا ہے لہٰذا بعض ایسے افراد کے بارے میں کہ جو آیاتِ الٰہی کے حامل تھے لیکن اس فیضِ الٰہی سے استفادہ نہیں کر سکے تھے فرماتا ہے:

"واتل علیھم نبأ الذی اٰتیناہ اٰیاتنا فانسلخ منھا فاتبعہ الشیطان فکان من الغوین"

(اور ان پر اس شخص کی خبر پڑھ دے جسے ہم نے اپنی (آیات) نشانیاں دی تھیں اور اس نے انھیں نظر انداز کر دیا پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔) (اعراف - ۱۷۵)

یعنی ہم نے اس شخص کو اپنی آیات دیں لیکن وہ "اخلاد الی الارض" رکھتا تھا (یعنی عالمِ خاک سے وابستہ تھا) لہٰذا ہماری آیات کے سائے سے نکل گیا۔ "انسلاخ" کا لفظ اس امر کی علامت ہے کہ درونِ انسان تاریک ہے اور یہ تو فقط کچھ پرتوِ نورِ الٰہی ہے کہ جس نے اس کے سیاہ باطن کو چھپا رکھا ہے اس طرح سے کہ کوئی اگر اس پردۂ نور سے نکل جائے تو اس کی داخلی تاریکی آشکار ہو جائے گی سورۂ یٰس میں "نسلخ" کی تعبیر قابلِ ملاحظہ ہے:

"وآیۃ لھم اللیل نسلخ منہ النھار فاذا ھم مظلمون"

(اور ان کے لیئے رات ایک نشانی ہے۔ اس میں سے ہم دن نکالتے ہیں ورنہ وہ اندھیرے میں ہی رہ جاتے۔) (یٰس - ۳۷)

یعنی ہم نے ایک روشن لباس دن کے نام پر بدنِ فضا کو پہنا دیا ہے اس طرح سے کہ اگر یہ جامہ ہم بدنِ فضا سے اتار لیں تو فضا کی تاریکی ظاہر ہو جائے گی اسی طرح بنی اسرائیل کے ایک عابد کے بارے میں فرماتا ہے کہ ہم نے اس اسرائیلی عابد کے بدن کو ایک نورانی لباس پہنا دیا لیکن وہ اس جامہ سے باہر آگیا اور ظلمانی ہو گیا یعنی وہ ذاتاً حاملِ نور نہ تھا۔

"ولوشئنا لرفعناہ بھا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ۔

(اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان (آیات) کی بدولت بلند کر دیتے مگر وہ تو ہمیشہ زمین کی طرف مائل رہا اور اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کی) (اعراف - ۱۷۶)

یعنی اگر ہم چاہتے تو اسے بلند لے جا سکتے تھے لیکن ہر کسی کو اپنی فکر و اختیار کی بنیاد پر کمال تک پہنچنا چاہیئے نہ کہ جبری طور پر لہٰذا اس اسرائیلی کے کمال میں "اخلاد الی الارض" ہی حائل تھا۔

سورۂ مبارکہ "ہمزہ" میں بھی تقرب الی اللہ کی سب سے اہم رکاوٹ مال و ارض کی طرف اخلاد ہی کو قرار دیا گیا ہے:

"ویل لکل ھمزۃ لمزۃ الذی جمع مالا وعددہ یحسب ان مالہ اخلدہ"

(وائے ہے ہر اُس شخص پر جو جمع کی ہوس میں رہتا ہے اور گنتا رہتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ جمع شدہ مال اور یہ گنی ہوئی دولت اُسے ہمیشہ کے لیے زمین میں باقی رکھے گی)۔

یہ زعمِ باطل اُس کے ارتقاء و کمال میں حائل ہے۔

مختصر یہ کہ اس آیتِ شریفہ کی بنیاد پر شرط ولایتِ توحید و عملِ صالح ہے:

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ"

جبکہ اس میں رکاوٹ دنیا کی رغبت ہے کہ جسے ایسے مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"اثاقلتم الی الارض"

(توبہ - ۳۸)

یا

"اخلد الی الارض" (اعراف - ۱۷۶)

یا

"فانسلخ منها"

(اعراف - ۱۷۵)

آیات میں انحصارِ ولایت:

بہرحال بحث کو جاری رکھتے ہوئے ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں کہ جن میں یا بالمطابقت یا بالالتزام[1] ولایت کو اللہ تعالےٰ میں منحصر قرار دیا گیا ہے اور دوسروں سے اس کی نفی کی گئی ہے وہ آیات کہ جو بالالتزام ولایت کو اللہ تعالےٰ میں منحصر ثابت کرتی ہیں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ آیات کہ جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ غیرِ خدا سے کچھ نہیں بن پاتا۔ دوم وہ آیات کہ جن کا مفہوم یہ ہے کہ غیر اللہ کی طرف توجہ نہ فقط لغو اور بے اثر ہے بلکہ زیان آور بھی ہے لہٰذا یہ آیات صراحت سے انسانوں کو غیرِ خدا کی ولایت سے ڈراتی ہیں اور ولایت و تدبیر کو ذاتِ مقدسِ الٰہی کے لیے ثابت کرتی ہیں سورۂ مبارکہ نساء آیت ۴۵ میں فرمایا گیا ہے:

---

[1] ویسے تو مطابقت اور التزام علم منطق کی اصطلاحات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں تاہم یہاں پر المطابقت کا مفہوم یہ ہے کہ بعض آیات واضح طور پر ولایت کو اللہ تعالےٰ میں منحصر قرار دیتی ہیں اور بالالتزام سے مراد یہ ہے کہ بعض آیات کے مفہوم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ولایت اللہ تعالےٰ میں منحصر ہے۔ (مترجم)

"واللہ اعلم باعدائکم وکفیٰ باللہ ولیًّا وکفیٰ باللہ نصیرًا"

(اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ ہی دوست کافی ہے اور اللہ ہی مددگار کافی ہے۔)

ولایت و نصرت کا فرق گذشتہ گفتگو میں بیان کیا جا چکا ہے۔ جہاں پر مولیٰ علیہ بچے کی طرح کچھ بھی نہ کر سکتا ہو وہ ولایت کا مقام ہے لیکن جہاں پر وہ کچھ کر سکتا ہے البتہ کچھ کمی درپیش ہو وہاں نصرت کا مقام ہے اللہ تعالےٰ اپنے آپ کو نصرت اور ولایت دونوں کے لیے کافی قرار دیتا ہے لیکن یہاں حذر کا لہجہ نہیں ہے بلکہ لسانِ کفایت ہے یعنی خدا کافی ہے اور غیرِ خدا کی طرف رجوع کی کوئی ضرورت نہیں نہ یہ کہ غیرِ خدا کی طرف رجوع کرنے سے خبردار رہو۔

سورۂ مبارکہ عنکبوت میں فرماتا ہے کہ غیرِ خدا کے بس میں کچھ نہیں۔ یہ ان آیات میں سے ہے کہ جو کہتی ہیں کہ کوئی خوف یا شوق سے بھی عبادت کرنا چاہے تو بھی غیرِ خدا کی طرف نہ جائے کیونکہ غیرِ خدا کے ہاتھ میں کوئی سود و زیان نہیں لیکن جن لوگوں کی عبادت کی بنیاد محبتِ الٰہی ہے وہ بت پرستی سے منزّہ ہیں کیونکہ وہ اپنے غضب و شہوت کی ولایت سے نجات پا کر اپنے خدا سے وابستہ ہو گئے ہیں سورۂ مبارکہ عنکبوت کی آیت ۴۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

"مثل الّذین اتّخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتّخذت بیتًا وانّ اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون"

(جو اللہ کے سوا دوسروں کو سرپرست بناتے ہیں ان کی مثال تو مکڑی کی سی ہے جس نے گھر بنایا اور بیشک سب گھروں سے بودا گھر تو مکڑی ہی کا ہے اے کاش وہ جانتے ہوتے۔)

جن لوگوں نے غیرِ خدا کو ولی بنا لیا ہے ان لوگوں کے حال کو اس آیت میں اس شخص کے حال سے مشابہ قرار دیا گیا ہے کہ جس نے تارِ عنکبوت سے وابستگی اختیار کی ہو۔

یہاں مکڑی سے تشبیہ نہیں دی گئی۔ جیسے انسان کا گھر ہوتا ہے اور وہ اس گھر میں سردی گرمی سے محفوظ رہتا ہے مکڑی بھی اپنے آپ دہن سے جالا بنتی ہے اور اپنے لیے پناہگاہ اور جائے امن تعمیر کرتی ہے اور اسی پناہگاہ میں کھاتی پیتی ہے۔ اس کا گھر اس کے لئے مفید ہے لہٰذا اگر آیۂ شریفہ میں مشبہ بہ عنکبوت یعنی مکڑی ہو تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ جیسے مکڑی اپنے گھر سے استفادہ کرتی ہے جو لوگ غیر خدا کو ولی بناتے ہیں وہ بھی اپنے اس کام سے بہرہ ور ہوں گے اور یہ امر اس مقصود کے خلاف ہے کہ قرآن کریم جسے بیان کرنا چاہتا ہے لہٰذا مشبہ بہ مکڑی کا کمزور اور لرزتا ہوا گھر ہے یعنی جیسے مکڑی کا جالا انسان کے کسی کام کا نہیں اسی طرح اسے غیر خدا سے بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔

دوسری طرح کی آیات وہ ہیں کہ جن میں غیر خدا کی طرف توجہ کو نقصان دہ قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ مبارکہ انعام کی آیت ۵۱ میں فرمایا گیا ہے:

" وانذر به الذين يخافون ان يحشروا الى ربهم ليس لهم من دونه ولي ولا شفيع لعلهم يتقون "

یعنی انھیں خبردار کر اور اعلان کر کہ غیر خدا نہ خود سے کچھ کر سکتا ہے نہ شرکت سے اور نہ شفاعت کے ذریعے خدا کے علاوہ ان کا کوئی ولی ہی نہیں کہ جو ان کے تمام کام خود اپنے ذمہ لے لے۔ ان کا کوئی شفیع بھی نہیں کہ جو ان کی کمی کی تلافی کرے اسی سورۂ مبارکہ انعام کی آیت ۶۲ میں ولایتِ الٰہی کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

" ثم ردوا الى الله مولاهم الحق الا له الحكم وهو اسرع الحاسبين "

یعنی حکم و حاکمیت خدا سے مختص ہے مسائلِ تشریع ہوں یا احکامِ تکوینی صرف اس کے احاطۂ تصرف میں ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالےٰ کی ولایت کے تحت ہیں کہ جو ان کا حقیقی مولا ہے اور خدا کے سوا ان کا کوئی مولا نہیں سورۂ مبارکہ یونس کی آیت ۳۰ میں ولایتِ الٰہی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

هنالك تبلوا كل نفس ما اسلفت وردوا الى الله مولاهم

الحق وضلّ عنهم ما کانوا یفترون "

(اس وقت ہر نفس جانچ لے گا جو کچھ عمل اس نے پہلے کیا تھا اور وہ اپنے حقیقی آقا و مولا اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے اور وہ جھوٹ جنہیں وہ گھڑا کرتے تھے ان سے گم ہو جائیں گے۔)

جو کچھ مشرکین جھوٹ باندھتے رہے وہ گم ہو گیا۔ مقصود یہ نہیں ہے کہ ان کے خدا تھے جو بعد میں گم ہو گئے۔ "ضلالت" کا معنی اور ہے اور "ضالہ" اور "ضالّہ" کا اور۔ ضالّہ ایک موجود خارجی ہے کہ جسے گم ہونا ہے لیکن "ضلالت" کا معنی گم ہونا ہے۔

حکمت کے بارے میں امیر المومنین علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"الحکمۃ ضالّۃ المؤمن"

(حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے)[1]

یعنی حکمت و معرفت ایک حقیقی وجودی امر ہے اور مومن اپنی اس کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں ہے لیکن "ضلالت" گم ہونے کے معنی میں ہے کہ جو امر وجودی نہیں ہے۔ فرماتا ہے کہ جو جھوٹ لوگ ہم پر باندھتے تھے ضلالت تھے کہ جنہیں وہ ہدایت خیال کرتے تھے اور یہ ضلالت قیامت کے دن ظہور کرے گی۔ بت پرستی ضلالت ہے قیامت میں بت پرست بت نام کی کسی چیز کو نہ دیکھ پائیں گے وہ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ پتھر و لکڑی ہے اور اس کا وہاں پر بت کے طور پر کوئی ظہور نہیں ہے کیونکہ وہ باطل تھا اور ضلالت ہے (گویا گم ہو گیا ہے)۔ سورۂ مبارکۂ حج کی آیت ۱۲ و ۱۳ میں اسی مفہوم کو ایک اور پیرائے میں بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

"یدعوا من دون اللہ ما لا یضرّہ و ما لا ینفعہ"

(وہ خدا کو چھوڑ کر انہیں پکارتے ہیں کہ جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع)

ان آیات کا مقصود و مدلول یہ ہے کہ چونکہ بیشتر انسانوں کی عبادت آگ کے خوف یا بہشت کے لالچ میں ہوتی ہے لہذا اللہ تعالے فرماتا ہے کہ یہ بت اور ہر غیر خدا نہ تمہارا

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر ۔۔

خوف دور کرتے ہیں اور نہ تمہارے لالچ اور امید کو عملی جامہ پہناتے ہیں چونکہ نہ یہ نفع بخش ہیں اور نہ ضرر رساں جبکہ نافع اور ضار اللہ تعالٰے کے اسماء حسنیٰ میں سے ہیں، جیسا کہ دعاؤں میں بیان کیا گیا ہے۔ بعد ازاں فرماتا ہے:

"یدعوالمن ضرّہ اقرب من نفعہ لبئس المولیٰ ولبئس العشیر"

(وہ اس کو پکارتا ہے جس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے اور وہ کیا ہی بُرا سرپرست اور بُرا ساتھی ہے)۔ (حج۔۱۳)

ایسا نہیں ہے کہ غیر خدا کی عبادت لغو اور بے اثر ہو بلکہ ایسی عبادت کفر ہے اور ضرر رساں کیونکہ غیر خدا کے تقرب کا نتیجہ آگ کے علاوہ اور کچھ نہیں لہٰذا انہوں نے نہ صرف یہ کہ ایسے مولیٰ کا انتخاب کیا ہے کہ جو نافع نہیں ہے بلکہ ضار ہے اور برا ہے۔ یہ دو آیتیں اکٹھی آئی ہیں تاہم ان میں سے ہر کوئی الگ الگ گروپ سے تعلق رکھتی ہے پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ غیر خدا کے بس میں کچھ بھی نہیں جب کہ بعد والی آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ غیر خدا کا تقرب نہ فقط سود مند نہیں ہے بلکہ زیاں آور ہے۔ ابھی تک جو آیات ذکر ہوئیں وہ بالالتزام اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ولایت خدائے سبحان میں ہی منحصر ہے، جب کہ دوسری قسم کی آیات وہ ہیں کہ جو بالمطابقت دلالت کرتی ہیں کہ ولایت اللہ تعالٰے میں منحصر ہے اور غیر خدا کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ سورۂ مبارکہ شوریٰ میں ولایت کے بارے میں بہت سی آیات ہیں۔ ان میں سے آٹھویں آیت میں یوں فرماتا ہے:

"والظّالمون مالھم من ولیّ ولا نصیر"

یعنی ظالم کا کوئی بھی ولی نہیں کہ جو اس کے سارے کاموں کو اپنے ذمہ لے سکے اور نہ ہی اس کا کوئی ناصر ہے کہ اس کی مدد کرے یہ آیت شریفہ ظالمین کے لئے ولایت و نصرت کی بالمطابقت دلالت کی بنیاد پر نفی کر رہی ہے اور دلالتِ التزامی کی بنیاد پر اللہ کے لئے ولایت کو ثابت کر رہی ہے۔ نویں آیت کہ جو یہاں ہماری دلیل ہے یوں ہے:

"ام اتّخذوا من دونہ اولیاء فاللہ ھوالولیّ"

(یا کیا انہوں نے اس اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں حالانکہ

اللہ ہی سرپرست ہے۔)

یہ آیۂ شریفہ اس آیۂ کریمہ کی مانند ہے " ذالک بان اللہ ھو الحق " (یعنی یہ اس لیے ہے کیونکہ اللہ ہی حق ہے) یہ آیت اللہ تعالیٰ کی ذات میں حصر ولایت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ خبر کا معرفہ ہونا مفیدِ حصر ہے خصوصاً جب کہ ایسی خبر سے پہلے ضمیرِ فصل لائی گئی ہو آیت کا مفہوم یہ ہے کہ غیرِ خدا کوئی بھی ہو باطل ہے اور ولایت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اس کے بعد اللہ کی قدرتِ مطلقہ کو اس کی دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:

" وھو یحی الموتیٰ وھو علی کل شیء قدیر "

(اور وہ مردہ کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔)

اسی طرح اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

" وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمتہ "

خدا ہے کہ جو بارش کو لوگوں کی ناامیدی کے بعد نازل کرتا ہے اور اپنی رحمت بکھیرتا ہے اور وہ ایسا ولی ہے کہ جو محمودِ مطلق ہے۔ ہر حمد کرنے والا جو حمد کرتا ہے خدا ہی کے بارے میں ہے کیونکہ حمد نعمت کے جواب میں ہے اور "وما بکم من نعمۃ فمن اللہ[1]" خدا کے سوا کوئی نعمت دینے والا نہیں لہٰذا اس کے سوا کوئی محمود بھی نہ ہوگا۔ اس لئے فرمایا " الحمد للہ " یعنی حمد اللہ سے مختص ہے۔ یہاں بھی فرمایا گیا ہے: وھو الولی الحمید " اور یہ اندازِ بیان بھی مفید حصر ہے۔

پس یہ آیات یا ولایت کو اللہ میں بالمطابقت منحصر قرار دیتی ہیں اور غیرِ خدا سے بالالتزام اس کی نفی کرتی ہیں، یا غیرِ خدا سے بالمطابقت ولایت کی نفی کرتی ہیں اور نتیجتاً اللہ تعالیٰ کے لیے بالالتزام ثابت کرتی ہیں۔

" ولی " اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے: اس درس کی آخری بات

---

[1] نحل۔ ۵۳۔

یہ ہے کہ ہماری گفتگو زہد و عبادت وغیرہ کے بارے میں ہے کیونکہ ولایت دیگر امور کی نسبت زیادہ اہم ہے کیونکہ ولی اللہ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے ولایت کا کچھ حصّہ اگر انسان کو نصیب ہو جائے تو وہ " ھو الولی " کا مظہر ہو جائے گا۔ پھر اگر وہ دعا کرے گا تو فوراً بارش برسے گی یا معمول کے اسباب کے بغیر اسے رزق خصوصی میسر آجائے گا جیسے مریم کبریٰ کے بارے میں قرآن فرماتا ہے " کلما دخل علیھا زکریا المحراب وجد عندھا رزقا "[1] (جب بھی زکریاؑ ان کے پاس محراب میں داخل ہوتے تو دیکھتے کہ رزق ان کے پاس موجود ہے) جب کہ عابد و زاہد وغیرہ کا اوصافِ الٰہی اور اسماءِ حسنیٰ میں کوئی حق نہیں۔ وہ کہ جو مردہ کو زندہ کر سکتا ہے اور مادہ کائنات پر اثر انداز ہو سکتا ہے " ھو الولی " کا مظہر ہے تاہم جب تک انسان معرفت و اخلاص کے ساتھ عبادت و زہد کا راستہ طے نہ کرے " ھو الولی " کا مظہر نہیں ہو سکتا اور اس صورت میں اس سے کچھ نہیں بن پاتا بلکہ وہ صرف عابد یا زاہد ہے اور اللہ بھی بس اس کا ناصر ہے۔ اگرچہ یہ تمام امور مقامِ ولایت کے حصول کے لئے ضروری ہیں لیکن کافی نہیں ہیں۔ ولایت کی بنیاد معرفت و محبت پر رکھی گئی ہے معرفت و محبت جس قدر کامل ہوگی انسان کو اللہ تعالےٰ کی مظہریتِ ولایت کا اتنا ہی بلند مقام حاصل ہوگا یہ امر مخفی نہیں کہ ولایت کا زہد و عبادت وغیرہ سے فرق فصل اوّل سے مربوط ہے کہ جس میں مفہوم ولایت کے بارے میں گفتگو کی گئی۔

والحمد للہ رب العالمین

○

[1] آل عمران ۔ ۳۷

درس ۷

ولی کون ہے؟

گذشتہ گفتگو سے ولی کی صفات بطور کلی واضح ہوگئیں لیکن کلی شناخت کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ کسی معین ولی کی شناخت کرے تاکہ اپنے دینی امور اس سے حاصل کرے لہٰذا ناگزیر ہے کہ مصداقِ ولی کی جستجو کی جائے۔ یہی ہماری پانچویں فصل کا موضوعِ بحث ہے یعنی "الولیّ من ھو؟" ولی کون ہے؟ مصداق ولی کی جستجو کلامی بحثوں سے مدد لیے بغیر ممکن نہیں چونکہ خالص عقلی بحثوں کے ذمہ شخصی والفرادی مسائل نہیں ہیں اس لیے کہ قضایائے شخصی میں برہان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ برہان کے مقدمات کو کلی، ذاتی، دائمی اور ضروری ہونا چاہیئے اس لحاظ سے اگر ہم کسی انسانِ کامل کی ولایتِ شخصی کا سراغ لگانا چاہیں تو مباحثِ نقلی کا سہارا لیے بغیر ممکن نہیں۔ البتہ عقل کی روشنی میں۔

معرفت و اخلاص راہِ ولایت میں ناگزیر ہیں:

بحثِ ولایت میں اہم ترین فصل یہی فصلِ سوم ہے کہ جو ولایت تک پہنچنے کے لئے راستے کی نشاندہی کرتی ہے۔ جس طرح پہلے گزر چکا ہے کہ ہر وہ عمل باعثِ تقرب الٰہی ہے جو بذاتِ خود تقربِ خدا کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس عمل کو انجام دینے والا بھی اسے خدا کے لئے بجالائے یعنی حسنِ فعلی بھی ملحوظِ نظر ہو اور حسنِ فاعلی بھی۔ اور اگر کوئی بندہ خدا کے نزدیک ہو تو اس کی قربت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے ان خصوصیات پر مشتمل اعمال دو طرح کے ہیں۔ مقام ولایت کے حصول کے لیے ان میں سے بعض اعمال فرض کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض نفل کی۔ جیسے بہشت تک پہنچنے کے لئے کچھ فرائض ہیں اور کچھ نوافل۔ اسی طرح بلند مقاماتِ انسانی کہ جو درحقیقت ایک طرح کی بہشت ہی ہے

تک پہنچنے کے لیے بھی کچھ واجبات ہیں اور کچھ مستحبات۔ اس راہ میں جو چیز بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور فریضے کا مقام رکھتی ہے وہ عمل میں معرفت اور اخلاص ہے۔ جتنی معرفت زیادہ ہوگی عمل میں اخلاص بھی اتنا ہی بیشتر ہوگا۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوذر رضوان اللہ علیہ سے فرمایا: "اے ابوذر! اگر انسان نیکی کا حامل ہو (نیکی اپنے اسی معنی میں کہ جو قرآن میں ذکر ہوا ہے) تو اسے بہت زیادہ دعا کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تھوڑی سی دعا سے ہی اپنی مشکل حل کر لیتا ہے۔ دعا کھانے میں نمک کی مانند ہے۔ جو چیز انسان کے لئے فرض ہے وہ یہ ہے کہ وہ عمل میں معرفت اور اخلاص کا حامل ہو اور زبانِ حال و لسانِ استعداد سے دعا کرے۔ اس صورت میں لفظی دعائیں نقل اور کھانے میں نمک کی مانند ہیں۔ لیکن اگر انسان اس امید پر معرفت و اخلاص میں کمی کرے اور دعا زیادہ کرے کہ مقامِ ولایت اسے مفت میں مل جائے یا بہشت کے دروازے اس کے لیے کھول دیئے جائیں تو جان لے کہ اس کام سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

اللہ تعالےٰ نے بھی وعدہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"[1]

یعنی اگر کوئی ہماری راہ میں کوشش کرے تو ہم اس کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد و کوشش کے کئی مصداق اور نمونے ہیں یقیناً معرفت اور شناختِ حق کے لیے کوشش اس کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسی طرح راہِ حق کو طے کرنے کے لیے کوشش اور اس راہ سے ہر طرح کے فردی اور اجتماعی موانع کو دور کرنے کے لیے جد و جہد نیز اس راہ کو راہزنوں سے پاک کرنا اللہ کی راہ میں جہاد شمار ہوتا ہے اور اس مجاہدہ اور کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ کوشش اور جد و جہد کرنے والا اللہ تعالےٰ کی خاص راہنمائی کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ البتہ یہ راہنمائی راستہ دکھانے کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ایسی راہنمائی تو سب انسانوں چاہے مومن ہوں یا کافر، کو کر دی ہے بلکہ یہاں مراد مطلوب تک پہنچانا ہے کہ جو ولایت سے متحد ہے۔

---

[1] عنکبوت - ۶۹

پس ولایت کے بلند و بالا مقام تک پہنچنے کے لئے بہترین راہ عمل میں معرفت اور اخلاص اور ان دو مقدمات کے حصول یا ان کی تقویت کے لئے کوشش ہے۔ ایسی آیات میں تدبر اور سوچ بچار کہ جو راہِ وصولِ معرفت و اخلاص کو بیان کرتی ہیں اس ہدف میں کارآمد ہیں۔

عبادت ہی تقرب کا ذریعہ ہے:

متعدد آیات کہ جو یہ بیان کرتی ہیں کہ عبادات کے ذریعے تقرب الٰہی ممکن ہے ہیں سے ایک یہ آیۂ کریمہ ہے:

"کلا لاتطعہ واسجد واقترب"

(تو ہرگز اس کا کہنا نہ مان۔ پس سجدہ کر اور تقرب حاصل کر۔) (علق-۱۹)

اس کی تلاوت سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ سجدہ کرو اور اللہ کے نزدیک ہو جاؤ۔ یہ بات واضح ہے کہ سجدہ سے مراد نماز و عبادت ہی ہے۔ سجدہ چونکہ نماز کا اہم ترین مقام ہے اس لیے جز کہہ کر کل مراد لیا گیا ہے اور نماز پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

عبادت ــــ زینۂ یقین:

ایک اور آیتِ کریمہ کہ جو یہی نکتہ بیان کرتی ہے یہ ہے:

"فسبح بحمد ربك وكن من السٰجدين واعبد ربك حتىٰ يأتيك اليقين"

(پس اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا اور اپنے رب کی بندگی کیے جا حتیٰ کہ تو منزل یقین تک پہنچ جائے)

(حجر-۹۸-۹۹)

یہ آیۂ شریفہ عبادت کو معرفت و یقین کا ذریعہ قرار دے رہی ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں

کلمۂ "یقین" اپنے لغوی معنی میں ہی استعمال ہوا ہے اور اگر روایت میں یقین کو موت سے تعبیر وتفسیر کیا گیا ہے تو یہ اس کا ایک مصداق ذکر کیا گیا ہے نہ کہ خود یقین کے مفہوم کی تفسیر کی گئی ہے اور یقین پر موت کے اطلاق کی وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں عالمِ طبیعت کے تاریک اور ظلمانی پردے ہٹ جاتے ہیں اور تیز بین برزخی نگاہیں جمالِ حقائق کا نظارہ کرتی ہیں اور یوں تمام شک وشبہات دور ہو جاتے ہیں اور یقین ان کی جگہ لے لیتا ہے۔

یہاں لفظ "حتیٰ" بھی غایت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس سے منفعت کا مفہوم معلوم ہوتا ہے لہٰذا یہاں آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ عبادت کا ہدف حصولِ یقین ہے یعنی عبادت کرو تاکہ یقین تک پہنچ جاؤ اور نتیجتاً اگر کوئی یقین تک پہنچ گیا تو عبادات کو چھوڑ سکتا ہے ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ عبادت کا ایک فائدہ حصولِ یقین ہے اور یقین تک دسترس بغیر عبادت اور بندگی کے ممکن نہیں مثلاً اگر کہا جائے کہ سیڑھی سے اوپر جاؤ تاکہ تمہارا ہاتھ اس بلند ٹہنی تک پہنچ جائے اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ٹہنی تک ہاتھ پہنچتے ہی سیڑھی کو چھوڑ دو، کیونکہ سیڑھی کو چھوڑنا یقیناً گرنے اور مرنے کا باعث ہے۔

لہٰذا آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ یقین زینۂ عبادت کے درجوں پر استوار ہے اور بلندی کی طرف لے جانے والی اس چیز سے کنارہ کشی انسان کو تنزل کے گڑھے میں پھینک دیتی ہے:

"ومن یشرك بالله فكأنما خرّ من السمآء فتخطفه الطّير او تهوی به الرّيح فی مكان سحيق"

(اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے گا تو گویا وہ ایسا ہے کہ آسمان سے گرا ہو اور اسے پرندے نے اچک لیا ہو) (الحج - ۳۱)

توحیدِ افعالی ــ حاصلِ عبادت:

ایک اور نکتہ جو اس آیۂ کریمہ میں قابلِ غور ہے یہ ہے کہ یقین کس کے بارے میں ہے اور وہ کون سا یقین ہے کہ جس کے حصول کے لیے یہ آیت ہمیں عبادت کی دعوت

دیتی ہے ؛ مسلماً یہ وجودِ مبداء کے بارے میں یقین نہیں ہے کیونکہ ایسا یقین تو خود عبادت کا سرچشمہ ہے نہ یہ کہ عبادت کا عمدہ نتیجہ اور اولیاءِ الٰہی کے مقامات کا ایک مقام، بلکہ یہ یقین تمام تر اوصافِ مطلقہ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے وجود پر یقین سے عبارت ہے۔ اللہ تعالےٰ کی ربوبیتِ مطلقہ پر یقین ہو تو کسی اور کی تدبیر و ربوبیت کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح اس کی مالکیتِ مطلقہ کا یقین مالکیتِ غیر کو مسترد کر دیتا ہے۔ اگر کوئی یقین کے اس مرحلے پر آپہنچے یعنی وجودِ خدا پر یقین کے علاوہ اسے عالَم پر اللہ کی ربوبیت و مالکیتِ مطلقہ کا بھی یقین ہو تو پھر خود سے اعتباری مالکیتوں کی نفی کرنے لگتا ہے اور انہیں اللہ کی مالکیت جانتا ہے بلکہ اپنے آپ کو اور اپنے تمام امور کو اللہ ہی کا سمجھتا ہے اگر کسی پر یہ بات واضح ہو جائے کہ انسان کی ادراک و تحریک کی قوتیں مِلک و مِلکِ خدا ہیں تو وہ ان قوتوں سے جو بھی کارِ خیر انجام دیتا ہے تو انہیں مِلک و مِلکِ خدا جانتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ، آنکھ اور دیگر اعضاء سے کارِ خیر انجام پایا ہے کیونکہ ساری کائنات میں جو کوئی بھی کچھ کرتا ہے وہ حق تعالےٰ کا کارندہ ہے۔ "وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے لیئے ہیں)[1] اگر اس امر کی طرف توجہ کیجائے کہ نظامِ ہستی میں اس عمل اور کارِ خیر کے وجود میں آنے کی ضرورت تھی تو ممکن ہے کہ اللہ تعالےٰ اسے کسی اور شخص کی آنکھ، کان اور اعضاء سے کروا لیتا ۔ لہٰذا اگر انسان کو نیک کام کرنے کی توفیق ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو مالکِ مطلق، ربِ مطلق اور قادرِ مطلق کا مدیون اور رہین سمجھے اور صمیمِ دل سے اس کا شکر گزار ہو۔

آیات میں توحیدِ افعالی :

سورۂ مبارکہ یونس میں توحیدِ ربوبی اور اس کے نتیجے میں توحیدِ افعالی کا ذکر یوں فرماتا ہے :

---

[1] فتح - ۴ ، ۷

"قل من یرزقکم من السماء والارض"[1]

کہو! آسمان اور زمین سے تمہیں کون رزق دیتا ہے؟ ممکن ہے کچھ لوگ یہ سمجھ سکیں کہ خدا رازق ہے لہٰذا دقیق تر سوال فرماتا ہے:

"امن یملك السمع والابصار"[2]

تمہارے گوش و چشم کا کون مالک ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کان اور آنکھ کا مالک ہے یعنی آنکھ اور کان کا جسم بھی اللہ کی ملک ہے اور ملکِ چشم و گوش بھی اللہ کے احاطۂ تصرف میں ہے یعنی "بیدہ الملك" کا وہ مالک ہے اور "بیدہ الملک" کا وہ مَلِک ہے اللہ مالک بھی ہے "للہ ما فی السموات والارض"[3] اور مَلِک بھی ہے "للہ مُلك السّموات والارض"

گذشتہ گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ادعا نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہمارے قویٰ کو خلق فرمایا اور پھر عاریتاً انہیں ہمیں سونپ دیا۔ کیونکہ یہ توجیہ اگرچہ قویٰ کی ملکیت کو اللہ تعالےٰ کے لئے ثابت کرتی ہے لیکن اُن کا مَلِک بندے کو تفویض کر دیتی ہے کیونکہ جب کوئی مال کسی کو عاریتاً دیا جاتا ہے تو اس مدت میں وہ مال مستعار لینے والے کے تسلط اور کنٹرول میں ہوتا ہے نہ کہ دینے والے کے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی ملک تو دینے والے سے حاصل کی گئی ہوتی ہے لیکن مَلِک لینے والے کے اختیار میں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ توجیہ بھی اللہ تعالےٰ کو مالکِ مطلق کے طور پر پہچاننے سے ہم آہنگ نہیں۔ وہ واحد توجیہ کہ جو ادراک و تحریک کی قوتوں کی انسان کی طرف نسبت کے لیے مناسب ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی مالکیتِ مطلقہ کے منافی بھی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ انسان جمالِ حق کا آئینہ ہے۔

آئینہ ہونے کا مفہوم

اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ مرآت (آئینہ) اہلِ معرفت کی اصطلاح میں اس صورت کو کہتے ہیں کہ جو آئینے میں دکھائی دیتی ہے نہ کہ آئینے کے جسم کو۔ کیونکہ وہ چیز کہ جو سبب بنتی

---

[1] یونس - ۳۱ [2] یونس - ۳۱ [3] یونس - ۵۵

ہے کہ انسان اپنے تئیں دیکھ سکے درحقیقت وہ صورت ہے کہ جو آئینے میں موجود ہے اور صاحبِ صورت کے تمام خدوخال کی نشاندہی کرتی ہے نہ کہ شیشہ اور اس کے پیچھے مُلا ہوا مصالحہ کہ جسے عام لوگ آئینہ کہتے ہیں۔

مظہریتِ انسان

اس نقطۂ نظر سے انسان ایک ایسی ذات کا مظہر ہے کہ جو تمام کمالات کی جامع ہے۔ یوں اللہ تعالےٰ کی ذاتِ مقدس میں ولایت کے منحصر ہونے کا مفہوم پوری طرح سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جس نے "فاللہ ھوالولی" یا "ھوالولی الحمید" کی بنیاد پر یہ قبول کر لیا کہ ولیٔ مطلق خدا ہے وہ اپنے لیے یا کسی اور کے لیے جہانِ امکان کے کسی گوشے میں ولایت کا قائل ہرگز نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا اگر کوئی کہتا ہے کہ اپنے ادراکی اور تحریکی قویٰ پر ولایت رکھتا ہوں یا کہتا ہے کہ میں نے بہت زحمت کے ساتھ علم حاصل کیا ہے، ایسا شخص معرفت کے ابتدائی کوچوں کے پیچ و خم میں ہے اور توحیدِ حقیقی کی راہ نہیں پا سکا۔ توحیدِ افعالی کے مراحل کو ایسے شخص نے بخوبی طے کیا ہے کہ جو یہ پالے اور جان لے کہ انسان تمام حالات میں آئینۂ حق، مظہرِ کمالِ مطلق اور "ھوالولی" کا نمونہ و آیت ہے۔

اگر آئینے میں موجود صورت بات کرنا چاہے تو وہ یوں کہے گی کہ میں صاحبِ صورت کی آیت و مظہر ہوں لہٰذا ایک کامل انسان کہ جس کے لئے یہ معارف واضح ہیں وہ کہتا ہے میں "ھوالولی" کا مظہر ہوں یعنی کام کوئی اور کرتا ہے، میں فقط اس کی علامت ہوں اور اس چیز کی نشاندہی کرتا ہوں کہ یہ کام اس نے انجام دیا ہے اگر معرفت کا یہ مقام حاصل ہو جائے تو انسان نہ فقط سماعت و بصارت کے بارے میں کہتا ہے "أمن یملك السمع والابصار" بلکہ وہی بات کہتا ہے کہ جس کا اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا ہے "ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین" یعنی انسان کی حیات و موت اور عبادات بھی ملک و ملکِ خدا ہیں۔ بہرحال یہ توجیہ وہ صراطِ مستقیم ہے

کہ جو انسان کو جبر و تفویض کے جال میں پھنسنے سے بچاتی ہے اور ولایت کے صحیح معنی کو قبول کرنے کی راہ ہموار کرتی ہے اگرچہ بال سے زیادہ باریک ہے اور شمشیر سے زیادہ تیز۔

امر بین الامرین کا مفہوم

جبر و تفویض کا مسئلہ توحید افعالی سے جدا نہیں ہے امر بین الامرین کا دو طرح سے معنی کیا جاتا ہے ان میں سے ایک دقیق ہے اور دوسرا دقیق تر۔ دقیق معنی کہ جو معروف ہے یہ ہے کہ انسان صاحب اختیار ہے اور خیر و شر کے دوراہے پر کھڑا ہے اگر اس نے برائی کی تو اس کی سزا پائے گا اگر بھلائی کی تو جزا کا مستحق ہوگا نہ جبر ہے اور نہ تفویض یعنی نہ تو سارے کام اللہ تعالے نے اس پر ٹھونس دیئے ہیں اور نہ سارے کام اسے سونپ دیئے ہیں بلکہ امر بین الامرین ہے البتہ عقلی مباحث میں اس کی تفسیر کچھ دقیق تر کی جاتی ہے کہ جس کا نتیجہ توحید افعالی ہے اور اسی سے صور مرآتیہ و مظہریت کا نظریہ مطابقت رکھتا ہے اللہ تعالے سورۂ نحل میں فرماتا ہے۔

"وما بکم من نعمۃ فمن اللہ" (نحل۔۵۳)

تمہارے پاس سب نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں اگر کسی نے اطاعت کی تو یہ اطاعت نعمت ہے اس نعمت کا ولی کون ہے؛ ممکن ہے کہا جائے کہ اللہ تعالے نے ہمیں عقل اور اختیار عطا کیا، نبی بھیجے اور ہم نے انہی کے باعث اطاعت کی۔ ملاحظہ کریں کہ اس توجیہ کے اعتبار سے انسان کو انتخاب میں مستقل اور آزاد فرض کیا گیا ہے اور تفویض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اللہ تعالے کے مقابلے میں عبد کو با استقلال اور آزاد فرض کر لیا جائے اسی لیے فقیہ ہمدانی قدس سرہ "کتاب طہارت" میں فرماتے ہیں کہ بہت سے علماء کہ جو نفیٔ جبر کے درپے تھے دامِ تفویض میں گرفتار ہو گئے اور یہ خیال کیا ہے کہ انہوں نے امر بین الامرین کو ثابت کر دیا ہے رازِ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ کی ولایت و ربوبیت لا محدود و مطلق ہے تو پھر اس تدبیر و ولائے لا محدود کے مقابلے میں کسی بھی دوسری ربوبیت و ولایت کا فرض کرنا معقول نہیں ہے۔ معقول اللہ کے حضور انسان کی

مظہریت اور آئینہ ہونا ہی ہے۔

توحیدِ افعالی کا اثر انسانی کردار پر

اگر انسان اس انتہائی بلند مقام کو حاصل کرے یعنی نہ صرف یہ کہ آسمانوں اور زمین کو ملک و ملکِ خدا سمجھے بلکہ اپنے آپ کو اور اپنے سارے آثار کو بھی اسی کی تدبیر و ولایت کے تحت مشاہدہ کرے اور اپنے آپ کو ظہورِ حق کا ایک مظہر اور اس کی تجلی کا مقام اور اس بے نشان کی نشانی سمجھے تو وہ اپنے کردار و رفتار پر بہت زیادہ توجہ دے گا اور کوشش کرے گا کہ اس سے محضرِ ربوبیت میں کوئی بے ادبی اور غفلت نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو ذر رضوان اللہ علیہ کو جو نصیحت کی وہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"یا اباذر أتحبّ ان تدخل الجنّة"

(اے ابا ذر! کیا تم چاہتے ہو کہ جنت میں جاؤ؟)

انہوں نے کہا:

"نعم فداك ابی"

(جی ہاں، میرے باپ آپ پر فدا ہوں)

تو رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

"فاقصُر من الامل واجعل الموت نصب عینیك"

(تو پھر اپنی آرزوؤں کو کم کر دو اور موت کو اپنا نصب العین قرار دو)۔

"واستح من اللہ حق الحیاء"

(اور اللہ سے یوں حیا کرو جیسے حیا کرنے کا حق ہے)۔

ابو ذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی:

"یا رسول اللہ کلّنا نستحیی من اللہ"

(یا رسولؐ اللہ ہم سب اللہ سے حیا کرتے ہیں)۔

تو نبی پاک (ص) نے فرمایا:

"لیس ذٰلک الحیاء ولکن الحیاء من اللہ ان لا تنسی المقابر والبلی والجوف وما وعی والرأس وما حوی و من اراد کرامۃ اللہ فلیدع زینۃ الدنیا فاذا کنت کذٰلک اصبت ولایۃ اللہ"

خدا سے حیا یہ نہیں ہے بلکہ حیا یہ ہے کہ قبر اور اس میں بوسیدہ ہو جانے کو فراموش نہ کرو، شکم اور غذا کو کنٹرول کرو، سر اور اس میں پروان چڑھنے والے افکار کو قابو میں کرو کیونکہ یہ سب اللہ کی نظروں میں ہیں۔ جس کسی کو کرامت الٰہی کی طلب ہو اسے چاہیئے کہ زینتِ دنیا کو چھوڑ دے اگر تم نے ان مراحل کو طے کر لیا تو تم نے ولایتِ الٰہی کو پا لیا۔

ایک اور جگہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

"یا ابا ذر ان اہل الورع والزہد فی الدنیا ھم اولیاء اللہ حقاً"

یعنی اے ابوذرؓ! جو دنیا کو چشمِ بے رغبتی سے دیکھتے ہیں اولیاء الٰہی ہیں البتہ زہد و ورع ولایتِ الٰہی کی علامت ہے۔ جو کوئی بھی ولی اللہ ہو گا اہلِ زہد و ورع ہو گا ایسا نہیں ہے کہ جو کوئی بھی اہلِ زہد و ورع ہو گا ولی اللہ ہو گا۔

خلاصہ یہ کہ جو چیز ولایت کے مقامِ بالا تک پہنچنے کے لئے فرض اور ضروری ہے وہ خدا اور اس کے اسمائے حسنیٰ کی معرفت اور عمل میں اخلاص سے عبارت ہے۔

والحمد للہ رب العالمین

○

درس ۸

قرآن کریم میں ولایتِ انسان کی بحث کی تیسری فصل کا خلاصہ یہ تھا کہ ولایت کے وجود میں آنے کا اہم ترین عامل معرفت اور مخلصانہ عمل صالح ہے یہ دونوں فریضہ کی مانند ہیں اور باقی چیزیں نافلہ کی مانند۔ اساسِ ولایت سے متعلق وہ معرفت ہے کہ جس کا نتیجہ توحید، توحیدِ صفاتی اور توحیدِ ذاتی ہے اس طرح سے کہ انسان ہر فعل، صفت اور ذات کو اللہ تعالےٰ کے فعل، صفت اور ذات میں فانی پائے ایسی معرفت انسان کے ولی اللہ ہو جانے کا سبب بنتی ہے لیکن وہ معرفت کہ جو نظم، امکان، حدوث یا دیگر براہین عقلی کا نتیجہ ہے اس میں یہ دم خم نہیں کہ توحیدِ افعالی، توحیدِ صفاتی اور توحیدِ ذاتی کا باعث بنے لہٰذا وہ انسان کو مقامِ ولایت تک نہیں پہنچاتی بلکہ زیادہ سے زیادہ عبادت یا زہد وغیرہ جیسے اخلاقی کمالات کا باعث بنتی ہے۔

توحیدِ افعالی اساسِ ولایت ہے

ایسی معرفت کہ جو اساسِ ولایت ہے، کے حصول کے لیے قرآن کریم کی بعض آیات میں تدبر ضروری ہے ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

"وما بکم من نعمة فمن الله" (النحل۔ ۵۳)

اس آیہ شریفہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ اور مبدأ پیدائش فقط خدا ہے اس طرح کہ یہ نعمتیں صرف اپنی پیدائش اور حدوث میں خداوند سبحان سے منسوب ہیں لیکن اپنی بقاء کے لیے اس کی محتاج نہیں ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر وہ نعمت کہ جو اس عالم ہستی میں تحقق پذیر ہوتی ہے اپنی پیدائش اور بقا دونوں اعتبار سے خدا کی محتاج ہے کیونکہ ہر نعمت کا جسم و بدن اللہ تعالےٰ کی ملک ہے اور خدا ہی اس کا مالک ہے نیز اس میں تصرف اور تسلط بھی اس کا ملک ہے

کیونکہ اللہ تعالےٰ ملک ہے اور یہ تصرف و تسلط آیۂ کریمہ " مالک الملک " کی بناء پر کہ جو تسلط و تصرف کو اسی کی ذات کے لیئے مختص سمجھتی ہے، اسی کی ملکِ مطلق ہے۔

یہ دانش وبینش انسان کو تنبیہ کرتی ہے کہ تمام نعمتیں امانت کے طور پر انسان کو دی گئی ہیں اور وہ ان امانتوں کا امین ہے نہ کہ مالک۔ اس لحاظ سے ان امانتوں کو جتنا جلدی ہو سکے اس کے حقیقی مالک کہ جو اللہ تعالےٰ ہے کو لوٹا دے:

" ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا "

(تحقیق اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کی طرف لوٹا دیا کرو)

(نساء — ۵۸)

انسانی وجود و ہستی ایک الٰہی امانت ہے اور ولایت کے بلند و بالا مقام کے حصول کی ایک شرط یہ ہے کہ یہ امانت موت سے پہلے اس کے مالک کو لوٹا دی جائے کیونکہ موت کے وقت تو وہ چاہے نہ چاہے یہ امانت اس سے لے لی جائے گی، اور زبردستی لوٹائے جانے کو ادائے امانت نہیں کہتے۔ پس جب کوچۂ ولایت کے سالک و راہی نے ہر اس چیز سے ہاتھ کھینچ لیا کہ جو اس کے اختیار میں ہے تو سرور و سردار اولیاء الٰہی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے اس حقیقت کی یوں نغمہ سرائی کرے گا کہ " لا املك لنفسي نفعاً ولا ضراً "[1] یعنی کسی چیز کا بھی مالک نہیں ہوں۔ نہ تو اصل مال کا اور نہ اس کے نفع (ونقصان) کا اور نہ ہی اس کے کسی اور فائدے کا۔ کیونکہ انسان یا تو خود چیز کا مالک ہوتا ہے جیسے کوئی قالین خریدے (تو اس کا مالک بن جاتا ہے) یا اس کے نفع کا مالک ہوتا ہے جیسے اگر اسی قالین کو کرائے پر لے۔ یا نہ تو خود شے کا مالک ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے نفع کا بلکہ دیگر فوائد کا مالک بنتا ہے مثلاً اگر اسی قالین کو عاریتاً لے لے۔ ان صورتوں کے علاوہ نہ تو وہ خود چیز کا مالک ہوتا ہے اور نہ ہی نفع اور نہ ہی دیگر فوائد کا۔ اللہ تعالےٰ اپنے پیامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ وہ یوں

---

[1] اعراف — ۱۸۸

کہیے :

" قل لا املك لنفسي ضرًا ولا نفعًا الّا ما شاء الله لكل امّة اجل اذا جاء اجلهم فلا يستأخرون ساعة ولا يستقدمون "

(کہہ دے کہ میں اپنے نفس کے لئے کسی سود و زیان پر قادر نہیں ہوں سوائے اس کے کہ جو اللہ چاہے، ہر امت کے لیئے ایک وقت معین ہے. پس جب اس کا وقت آجاتا ہے تو نہ وہ ایک ساعت تاخیر اور نہ ہی تعجیل کر سکتے ہیں) (یونس - ۴۹)

اگر نکرہ نہی کے ساتھ واقع ہو تو عمومیت کا مفہوم دیتا ہے یعنی میں کسی بھی چیز کا مالک نہیں ہوں. کمترین نفع کا حصول یا کمترین ضرر سے بچاؤ میری دسترس میں نہیں ہے یہ آیۂ شریفہ قرآن میں دو جگہ پر آئی ہے. آیت کی ابتداء میں " قل " (کہو) کی تعبیر سے مراد صرف زبانی کہنا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ ان آیات سے اپنے رسول کو عالم و آگاہ کر رہا ہے، اسے ذاکر و قائل نہیں بنا رہا. بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ وہی وحی ہے کہ جو پہلے تیرے دل پر نازل ہوئی " نزل به الرّوح الامين على قلبك[1] " اور اب اسے تیری زبان پر جاری ہونا چاہیئے.

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ قول حضرت موسیٰ سلام اللہ علیہ کے اس قول کے منافی نہیں ہے کہ جسے قرآن نے یوں نقل کیا ہے " انّي لا املك الّا نفسي و اخي[2] " کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول تشریعی مسائل کے ضمن میں ہے. موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں : خدایا تو نے حکم دیا کہ ہم ایمان لائیں تو مجھے فقط اپنے ایمان لانے پر اختیار تھا اور میں ایمان لے آیا. میرے بھائی کو بھی صرف اپنے ایمان پر اختیار تھا پس وہ بھی ایمان لے آیا اور اس سے زیادہ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں؛ اس آیت کا معنی یہ نہیں کہ میں صرف اپنا اور اپنے بھائی کا مالک ہوں کیونکہ اس صورت میں " اخی " کو " نفسی " پر عطف لینا پڑے گا جب کہ یہ احتمال بہت بعید ہے. قوی احتمال یہ ہے کہ " اخی " اسم " انّ " یا " املك " میں موجود ضمیر " انا " پر

[1] شعراء ۱۹۳ - ۱۹۴ [2] مائدہ - ۲۵

عطف ہو۔ بہرحال یہ مالکیت تشریعی لحاظ سے ہے جب کہ تکوینی پہلو سے کوئی کسی چیز کا مالک نہیں ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مالکیت کی نفی پر مبنی قول تکوینی پہلو کے بارے میں ہے۔ لہٰذا یہ حضرت موسیٰ سلام اللہ علیہ کے قول سے کوئی تضاد نہیں رکھتا کہ جو تشریعی پہلو کے بارے میں ہے۔

اگر انسان معرفت کے لحاظ سے اس مقام تک پہنچ جائے تو پھر اپنے آپ کو کسی کام کا مبداء پاتا ہے اور نہ کسی اور کو، بلکہ تمام کاموں کو رب العالمین کی تدبیر کے ماتحت دیکھتا ہے لہٰذا حمد و ستائش کے لیے اس کے لب یوں وا ہوتے ہیں:

" فللہ الحمد ربّ السمٰوٰت وربّ الارض ربّ العالمین "[1]

اس آیۂ کریمہ میں کلمہ " رب " تین مرتبہ آیا ہے کہ جو اس آیت کی خصوصیات میں سے ہے اور اس کی عظمت کی علامت ہے ایک اور نکتہ کہ جو اس آیتِ کریمہ میں قابل ملاحظہ ہے یہ ہے کہ " ربّ العالمین " کا کلمہ " ربّ السمٰوٰتِ " اور " ربّ الارضِ " کے لیئے بیان ہے یعنی تفسیر و توضیح ہے اور ان پر عطف نہیں ہے۔

توحیدِ افعالی کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ راز کھل جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فتح مند مجاہدین کی طرف قتلِ کفار کی نسبت دینے کی بجائے اپنے آپ سے کیوں دی ہے، " فلم تقتلوھم[2] "، تم نے انہیں قتل نہیں کیا " ولٰکن اللہ قتلھم[2] " بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے اس امر کی وضاحت یہ ہے کہ اگر ہم محاذِ جنگ پر ایک ایسا آئینہ نصب کریں کہ جس میں سپاہیوں کا عکس دکھائی دے اب جو عکس دیکھنے کے لئے بیٹھا ہے انھیں مخاطب کر کے کہہ سکتا ہے کہ تم جنگ نہیں کر رہے ہو بلکہ صاحبِ صورت لڑ رہا ہے اور کامیاب ہو رہا ہے۔ اس مثال کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ جو مجاہد محاذِ جنگ پر حاضر ہوتا ہے حق تعالےٰ کی صورتِ مرآتیہ ہے۔ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ اس سے کہا جائے کہ اے صورتِ حق تو نے دشمن کو شکست نہیں دی بلکہ تیرے صاحب اللہ تعالےٰ نے یہ کام کیا ہے! اور " فلم تقتلوھم "

---

[1] جاثیہ - ۳۶ [2] انفال - ۱۷

میں نفی "ولکن اللہ قتلھم" میں اثبات مجازی ہے حقیقی نہیں۔ البتہ حق تعالیٰ کا فعل جنگ وجہاد سے مختص نہیں ہے بلکہ تمام اچھے کام، اطاعتیں اور عبادتیں حق تعالےٰ کا فعل ہیں جو مختلف مظاہر میں ظہور کرتا ہے البتہ معصیت، نقص اور شر اللہ تعالےٰ کی ساحتِ قدس سے دور ہیں۔ لہٰذا اسکی طرف نسبت نہیں دی جاسکتی یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چند گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

کل ذٰلک کان سیئہ عند ربک مکروھًا۔

(ان تمام باتوں کی برائی (جن سے منع کیا گیا ہے) تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے) [1]

اسی طرح اگر کوئی آئینہ کو "ما ینظر فیھا" [2] (جو کچھ اس میں دیکھا جائے) کے عنوان سے دیکھے پھر وہ آئینے میں صورت کو نہیں دیکھتا۔ جو کوئی غرور اور خود بینی میں مبتلا ہو وہ مشاہدۂ جمالِ حق سے محروم رہتا ہے پس سب گناہ خود بینی کی طرف لوٹتے ہیں اور ولایتِ الٰہی کے منافی ہیں۔ وہ ولایتِ الٰہی کہ توحیدِ افعالی جس کے لازم ترین مقدمات میں سے ہے۔

بندوں کے ذمہ صرف غیر خدا کی مالکیت نہ ماننا ہے

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ اس وقت تک یہ بات واضح ہوئی کہ غیرِ خدا سے ہر طرح کی ملک اور ملک کی نفی کی جائے گی اور اسے صرف خدا کے لیئے مانا جائے گا۔ جو چیز نہایت اہم ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے ذمہ صرف دوسروں سے مالکیت کی نفی کرنا ہے اور یہ نفیٔ مالکیت اس معنی میں نہیں کہ انسان پہلے اپنی اور دوسروں کی مالکیت کی نفی کرے پھر خدا کے لیے مالکیت قرار دے، بلکہ معرفتِ انسان رخِ آئینہ سے غبار صاف

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل - ۳۸

[2] "ماینظر فیہ" سے مراد وہ ہے کہ جو نظرِ استقلالی کے پیشِ نظر ہو یہ "ما ینظر بہ" کے مقابل ہے۔ اس سے مراد ایک ایسی چیز ہے کہ جسے آلے اور وسیلے کے طور پر دیکھا جائے۔

کرنے کی مانند ہے اس سے اللہ کی مالکیتِ مطلقہ کے ظہور کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ اللہ کی مالکیت اس کے وجود کی طرح مسلّم اور ناقابلِ تغیر حقیقت ہے کہ جو ہر انسان کی فطرت اور طبیعت میں گوندھ دی گئی ہے اور ایک حق طلب انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس حقیقت کے شہود کے لیئے اپنی نگاہِ بصیرت کے سامنے سے پردے ہٹائے اور حقیقت کے رخِ زیبا کا اپنی فطرت کے نہاں خانہ میں نظارہ کرے۔

یہی بات توحید کے بارے میں اور کلمۂ طیبہ "لا الٰہ الا اللہ" کے معنی کی تحلیل میں کہی جاسکتی ہے یہ کلمہ طیبہ دو جملوں اور دو جدا جدا قضیوں میں تحلیل ہو سکتا ہے ایک نفیٔ طاغوت کے بارے میں اور ایک اثباتِ حق کے بارے میں مقامِ روحِ انسان مقامِ توحید ہے۔ خدائے یکتا کا حضور و ظہور سب انسانوں کی فطرت میں ہے اس لحاظ سے "الا" یہاں غیر کے معنی میں ہے اور اس کلمۂ طیبہ کی بازگشت صرف ایک قضیہ کی طرف ہے کہ جس کا نتیجہ مقتضائے فطرت ہی کو ثابت کرتا ہے اور مراد یہ ہے کہ اس خدا تعالےٰ کے علاوہ کوئی اور خدا نہیں کہ جسے انسان کی فطرت پالیتی ہے اللہ کی مالکیت کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے اللہ تعالےٰ اپنے رسولؐ سے کہتا ہے کہ تو کہہ دے کہ تحریک اور ادراک کی قوتوں میں میری کوئی مالکیت نہیں اور اسی طرح ذات، وصف اور اپنے فعل میں بھی میری کوئی مالکیت نہیں ہے۔ نہ اپنے وجود کے کسی جز کا بالاستقلال تقسیم شدہ کسی حصّے کا مالک ہوں اور نہ اس میں میری کوئی غیر تقسیم شدہ ملکیت ہے، نہ رہن کی صورت میں اس میں میرا کوئی حق ہے اور نہ کسی اور صورت میں۔ میری ہستی کا مطلق مالک، مالکِ آسمان و زمین ہی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسانِ سالک کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حرمِ دل کو غیرِ خدا کی نجاست سے پاک کرے اور اپنے صحنِ وجود کو ہر غاصب کی دست بُرد سے محفوظ رکھے تاکہ انوارِ الٰہی اور حق تعالےٰ کی تدبیر و ربوبیت کے جلوہ فگن ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

حصولِ ولایت کیلئے ہدایتِ رسول اکرمؐ

اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ اقوال و مواعظ کہ جو ابوذر رحمۃ اللہ علیہ سے فرماتے تھے ہماری راہنمائی کرتے ہیں[1]

ابوالاسود کہتے ہیں کہ میں ابوذرؓ سے ملاقات کیلئے ربذہ گیا جہاں وہ جلاوطن کیے گئے تھے اس ملاقات میں انہوں نے میرے لیے یہ حدیث نقل کی فرمایا "ایک روز میں مسجدِ نبوی (ص) میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیؑ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں اور ان دونوں بزرگواروں کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں ہے میں نے موقع کو غنیمت جانا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی :

"بابی انت وامی اوصنی بوصیۃ ینفعنی اللہ تعالی بہا"

(میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمایئے کہ جس سے اللہ تعالےٰ مجھے فائدہ عطا کرے)

رسولؐ اللہ نے فرمایا : نعم (بجا ہے)

پھر فرمایا :

"یا اباذر انک منّا اھل البیت"

(اے ابوذر! تو ہم اہل بیت میں سے ہے)[2]

"وانّی اوصیک بوصیۃ فاحفظھا فانّھا جامعۃ لطرق الخیر وسبلہ فانک ان حفظتھا کان لک بھا کفلان"[3]

---

[1] بحار الانوار ج ۷۷، ص ۷۴

[2] جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں بھی آپؐ نے فرمایا ہے "سلمان منّا اھل البیت"

[3] یہاں انہی "کفلین من رحمتہ" کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا ذکر سورۂ حدید کے آخر میں آیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ مومنین کو یوں نوید دیتا ہے "یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ و اٰمنوا برسولہ یؤتکم کفلین من رحمتہ"

(میں تجھے ایک خاص وصیت کرتا ہوں اسے اچھی طرح سے یاد کرلے۔
یہ وصیت بھلائی کے راستوں کی جامع ہے اگر تو نے اسے پلّے باندھ لیا تو
پھر تمہارے لیے کفلان (دو حصے) ہیں۔)

مزید فرمایا:

"یا ابا ذر اعبد اللہ کانک تراہ"

یعنی تیری عبادت معرفت شہودی کی بنا پر ہو۔ اس طرح سے عبادت کر کہ گویا
تو خدا کو دیکھ رہا ہے۔

"فان کنت لا تراہ فانہ یراک"

(پس اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

لہٰذا یا تو شاہد ہے یا مشہود اور ہر دو حالت میں تو اہل شہود ہے کیونکہ یا تو ایسا شاہد ہے کہ جو مشاہدہ کر رہا ہے اور اس صورت میں تیرا شاہد ہونا تیرے لیے مشہود ہے اور یا تو ایسا شاہد ہے کہ جو مشہود ہے اور اس حالت میں تیرا مشہود ہونا تیرے لیے مشہود ہے اور یہ بھی ایک طرح کا شہود ہے۔

"واعلم ان اول عبادۃ اللہ المعرفۃ بہ"

(جان لے کہ اللہ کی پہلی عبادت اس کی معرفت ہے) [۱]

اس کے بعد معرفتِ خدا کے بارے میں آپؑ نے فرمایا:

فھو الاول قبل کل شیء فلا شیء قبلہ والفرد فلا ثانی

---

[۱] حضرت امیر سلام اللہ علیہ کے بہت سے بیانات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انہی فرمودات سے ماخوذ ہیں۔ یہ جو نہج البلاغہ یا روایات کی دیگر کتب میں حضرت امیر علیہ السلام سے منقول ہے کہ "اول الدین معرفتہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی قول سے حاصل کیا گیا ہے کہ "اول عبادۃ اللہ المعرفۃ بہ" یعنی عبادت اپنے عمومی معنی میں علمی عبادات سے شروع ہوتی ہے اور بہترین عبادت معرفت ہے۔

لہ والباقی لاالی غایۃ ، فاطر السمٰوٰت والارض وما فیھما و ما بینھما من شیٔ وھو اللطیف الخبیر وھو علیٰ کلّ شیٔ قدیر "

اگر " ھو الاوّل " ہے تو ہر چیز کے آغاز میں شہودِ حق کے علاوہ کچھ نہیں اور اگر " ھو الآخر " ہے تو ہر کام کا انجام بھی شہودِ حق کے سوا کچھ بھی نہیں اگر " ھو الظاھر " ہے تو انسان جو کچھ بھی مشاہدہ کرتا ہے حق تعالےٰ کے آثارِ جلال وجمال کے سوا کوئی اور چیز نہیں اگر " ھو الباطن " ہے تو انسان اپنے آپ میں یا کسی اور میں رازِ دروں کے نام پر جو کچھ دیکھتا ہے وہ بھی بطونِ حق کے سوا کچھ بھی نہیں البتہ یہ بات اللہ کے مقامِ فیض سے مربوط ہے ورنہ ذاتِ مقدسِ الٰہی کے مقام تک کسی کی دسترس نہیں۔ امیر المومنین فرماتے ہیں :

" لا یدرکہ بُعد الھمم ولا ینالہ غوص الفتن "

(نہ بلند پرواز ہمتیں اسے پاسکتی ہیں اور نہ عقل وفہم کی گہرائیاں اس کی تہہ تک پہنچ سکتی ہیں) (نہج البلاغہ ۔ خطبۂ اول)

مقامِ ذات نہ کسی فلسفی کے برہان کا مفہوم ہے اور نہ کسی عارف کی ریاضت کا مشہود۔ جو کچھ ظہور رکھتا ہے اور جو کچھ دسترس میں ہے وہ حق تعالےٰ کا فیض، اس کے آثار اور اس کی صفات ہیں۔ مذکورہ حدیث میں رسول اللہ (ص) فرماتے ہیں کیونکہ کوئی چیز اس سے قبل نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس کے ساتھ ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کے بعد ہے لہٰذا وہ " فاطر السمٰوٰت والارض وما فیہما وما بینہما "[1] ہے۔ اس لیے کہ مبادا کسی کو حلول یا اتحاد کا توہم ہو جائے مزید فرمایا " وھو اللطیف الخبیر وھو علےٰ کل شیٔ قدیر "

اس حصے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو صفات بیان کی ہیں قرآن

---

[1] وہ آسمانوں، زمین، جو کچھ ان میں ہے اور جو کچھ ان کے مابین ہے سب کا پیدا کرنے والا ہے (ترجمہ)

کریم میں اللہ تعالےٰ میں ولایت کو منحصر ثابت کرنے کے لیے جو کچھ بیان کیا گیا ہے ہم آہنگ ہیں اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آغازِ کلام سے یہ بات ثابت کرنا چاہتے تھے۔

"فاللہ ھوالولیّ" میں اللہ تعالےٰ میں جو انحصارِ ولایت کا ذکر ہے اس کی دلیل کے طور پر قرآن کریم فرماتا ہے:

"وھویحی الموتیٰ وھوعلیٰ کلّ شیءٍ قدیر" (شوریٰ ۹)

یعنی زندہ کرنا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جو زندہ کرنے والا اور حیات بخش ہے وہ ولی ہے پس اللہ ولی ہے اور اسی طرح سے قدرت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جو قدیر ہے وہ ولی ہے پس خدا ولی ہے:

"وما اختلفتم فیہ من شیءٍ فحکمہ الی اللہ"[1] (شوریٰ: ۱۰)

وہ حکم ہے اور جو حکم ہے وہ ولی ہے پس اللہ ولی ہے اس کے بعد کی آیات یہ ہیں:

"فاطر السّمٰوٰت والارض جعل لکم من انفسکم ازواجًا ومن الانعام ازواجًا یذرؤکم فیہ لیس کمثلہ شیءٌ و ھوالسمیع البصیر لہ مقالید السّمٰوٰت والارض یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انّہ بکل شیءٍ علیم"

(وہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی نفوس میں سے جوڑے بنائے اور چوپاؤں میں سے (ان کے) جوڑے بنائے۔ (اس طرح) وہ تمہاری افزائش (نسل) کرتا ہے۔ کوئی شے اس کی مثل نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کی کنجیوں کا مالک ہے۔ وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں کشادگی کرتا ہے اور (جس کیلئے چاہتا ہے) تنگی کرتا ہے۔ بیشک وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔) (شوریٰ۔ ۱۱-۱۲)

---

[1] (ترجمہ) جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا حکم اور فیصلہ اللہ کے ذمہ ہے۔

یہ سب مذکورہ عناوین اس برہان کے لیے حدِ وسط ہیں کہ جس کا نتیجہ ولایت کو اللہ تعالےٰ میں منحصر قرار دیتا ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے گفتگو کرتے ہوئے بعد ازاں آپؐ نے اپنی رسالت اور اہل بیت علیہم السلام کی محبت کا ذکر فرمایا کہ جن پر ایمان لانا مبانیٔ دین کی معرفت کے تتمہ کے طور پر نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

"یاابا ذر لیکن لك فی کلّ شیء نیّة حتی فی النوم والاکل"

(اے ابوذرؓ تمہیں چاہیئے کہ ہر امر میں نیت کو مدِ نظر رکھو، نیند میں بھی اور کھانے میں بھی۔)

کیونکہ اگر کوئی راہِ ولایت پر چلنا چاہتا ہو تو اسے نہ فقط عبادات کے مسائل میں بلکہ تمام مسائل میں نیت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ جو شخص حرام غذا سے اپنے آپ کو آلودہ کرے اور پُر خور ہو وہ نیتِ قربت نہیں کر سکتا۔ جو شخص سونے کے آداب کو ملحوظ نہ رکھتا ہو، نہ رو بہ قبلہ سوتا ہو نہ سوتے وقت وضو کرتا ہو اور نہ بستر خواب پر وارد دعائیں پڑھتا ہو، وہ نیند کیلئے قصدِ قربت نہیں کر سکتا۔

رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا:

اے ابوذرؓ قرآن پڑھتے ہوئے اپنی آواز کو آہستہ رکھو اور قرآن کی تلاوت خضوع و خشوع سے کرو۔

مزید فرمایا:

"یاابا ذر اذا تبعت الجنازة فلیکن عقلك فیها مشغولا بالتفکّر والخشوع واعلم انّك لاحق"

"اے ابوذرؓ! تشیعِ جنازہ کرتے ہوئے اپنی عقل کو سوچ و فکر میں مشغول رکھ اور جان لے کہ تو بھی اس سے ملحق ہوگا۔"

پھر فرمایا:

"یاابا ذر رکعتان مقتصدتان فی تفکّر خیر من قیام لیلة والقلب ساهٍ"

غور و فکر کے ساتھ دو رکعت نماز اس قیام لیل سے بہتر ہے کہ جس میں دل غافل ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ فرمودات معرفت و اخلاص کہ جو ولایت کے دو رکن ہیں، ولایت کے حصول کیلئے الٰہی راہنمائی ہیں اور اس راستے میں انسان کی مدد کرتے ہیں۔

والحمد للہ رب العالمین

○

درس ۹

گزشتہ گفتگو میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ معرفت اور عمل صالح میں اخلاص حصولِ ولایت کے لیے اصلی رکن ہیں۔ ان کی حیثیت فریضے کی سی ہے اور دیگر تمام اخلاقی امور نافلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معرفت عقلِ نظری کے کمالات میں سے ہے اور اخلاص عقلِ عملی کے کمالات میں سے ہے۔ معرفت کے بارے میں کچھ گفتگو ہو چکی ہے۔ اب ہم اخلاص کے بارے میں قرآنِ کریم کی کچھ آیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اخلاص کے بارے میں آیات

اللہ تعالےٰ سورۂ زمر میں فرماتا ہے:

"انا انزلنا الیک الکتاب بالحق فاعبد اللہ مخلصًا لہ الدین"

(ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی پس اس کے دین کا مخلص ہو کر اس کی عبادت کر۔) (زمر-۲)

بالحق میں اگر باء ملابسہ ہو تو آیۂ کریمہ کا معنی یہ ہے کہ یہ کتاب لباسِ حق میں نازل ہوئی ہے اور اگر باء مصاحبہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب حق تعالےٰ کی صحبت و ہمراہی میں نازل ہوئی ہے بہر حال یہ کتاب یا لباسِ حقیقت میں ہے یا ہمراہِ حقیقت

کسی صورت میں بھی حق سے جدا نہیں ہے اس لحاظ سے "فاعبد اللہ مخلصًا لہ الدین" کا مطلب یہ ہے کہ نہ فقط عبادات میں بلکہ پورے دین میں اخلاص کو ملحوظ رکھ اور اخلاص سے مراد یہ ہے کہ غیرِ خدا کی خواہش اور ہوا و ہوس عمل میں رخنہ انداز نہ ہو۔ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے:

"ألا لله الدّين الخالص"

(خبردار ہو کہ دینِ خالص اللہ ہی کے لیے ہے)۔

دین کو خالص سے توصیف کرنا اس امر کی علامت ہے کہ پورے دین میں منشاء الٰہی کے سوا کسی چیز کی گنجائش نہیں اور دین وہ ہے جو خالص ہو۔

واصب و خالص میں فرق:

قرآنِ کریم جب کمیتِ دین کے بارے میں بات کرتا ہے تو فرماتا ہے:

"وله الدّين واصبًا" (نحل: ۵۲)

یعنی تمام تر دین خدا کے اختیار میں ہے۔ تمام تر قوانین اسی کو بنانا ہیں چاہے واجبات ہوں، مستحبات ہوں، عبادات ہوں یا معاملات وغیرہ۔ جب احکامِ دین کی کیفیت کا ذکر کیا تو فرمایا: "ألا لله الدّين الخالص"۔ اللہ تعالےٰ صرف دینِ خالص کو قبول کرتا ہے لہٰذا تمام قوانین و احکام کو خلوص کے ساتھ انجام پانا چاہیے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا ہے:

"قل انّی امرت ان اعبد الله مخلصًا له الدّين"

(کہیے کہ میں مامور ہوں کہ اللہ کی عبادت خلوص کے ساتھ انجام دوں)۔

(زمر - ۱۱)

"وامرت لأن اکون اوّل المسلمين"

(اور میں مامور ہوں کہ اولین مسلمان ہوں)۔

(زمر - ۱۲)

البتہ یہ مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص ہے۔

اوّلین مسلمان ـــــ رسولِ اکرمؐ

قرآنِ کریم میں دو مقام پر رسولِ اکرمؐ کی صفت "اوّل المسلمین" بیان کی گئی ہے واضح ہے کہ اس اوّل سے مراد اوّلِ نسبی یا اوّلِ زمانی وغیرہ نہیں کیونکہ ہر نبی کا اپنی امت کی نسبت ایمان اوّلِ زمانی تو ہوتا ہی ہے جب کہ کسی بھی نبی یہاں تک کہ آدم سلام اللہ علیہ کے بارے میں بھی یہ وصف بیان نہیں ہوا۔ البتہ موسیٰ کلیم اللہؑ کے بارے میں کہ انہوں نے کہا میں اوّل المومنین ہوں لیکن یہ تعبیر مورد بحث تعبیر سے مختلف ہے۔ رسولِ اکرمؐ کو اس صفت سے متصف کرنے کا راز یہ ہے کہ وہ دینِ خدا کہ جسے سب انبیاء لے کر آئے ہیں اور جس پر وہ ایمان رکھتے تھے اسلام ہی ہے اور سب مسلمانانِ عالم انبیاء ہوں یا امتیں ہیں سے حضرت رسول اکرمؐ "اوّل المسلمین" ہیں اور یہ اوّلیت مطلق رتبے ہی کی اوّلیت اور تقدم کی علامت ہے کیونکہ جو انسان ظاہر اول یا صادرِ اوّل ہو۔ عرفاء اور حکماء کے نقطۂ نظر میں اختلاف کی بناء پر۔ اور جو اخذِ میثاق اور اطاعتِ مطلق کے موقع پر دوسروں سے پہلے مطیع ہوا ہو وہ کہہ سکتا ہے "انا اوّل المسلمین" جیسا کہ سورۂ مبارکہ اعراف کی آیت ۲۹ میں فرمایا گیا ہے:

"قل امر ربی بالقسط واقیموا وجوھکم عند کلّ مسجد و ادعوہ مخلصین لہ الدین کما بدأکم تعودون"

(کہدے میرے پروردگار نے انصاف کا حکم دیا ہے اور ہر سجدے کے وقت اپنے آپ کو (اسی کی طرف) متوجہ کرلو اور دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے اسے پکارو جس طرح اس نے تمہیں پیدا کیا ویسے ہی تم لوٹ کر جاؤ گے)

اپنی دعا اور دعوت میں مخلص ہوں اور غیرِ خدا کا آپ کے عقیدے میں دخل ہو اور نہ خلق و عمل میں۔ البتہ اس سلسلے میں فراواں آیات ہیں جن کے بارے میں تحقیق ہم کسی اور موقع پر اٹھا رکھتے ہیں اب ہم تبرکاً چند روایات کا ذکر کرتے ہیں کہ جن میں سے کچھ معرفت کے

بارے میں اور کچھ اخلاص کے بارے میں ہیں۔

کلامِ معصومینؑ میں معرفت :

اصولِ کافی کی کتاب "ایمان وکفر" میں ایک باب ہے جس کا نام ہے باب حقیقت ایمان ویقین کہ جو اوّلین فریضے اور اصول کے بارے میں ہے۔اس باب کی پہلی روایت یہ ہے :

ایک سفر کے دوران میں چند سوار رسول اللہؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے اور عرض کی :

"السلام علیك یارسول اللہ

آپؐ نے فرمایا :

"ما انتم"

تم لوگ کون ہو؟

کہنے لگے :

"نحن مؤمنون یا رسول اللہ"

اے اللہ کے رسول ہم مؤمنین ہیں۔

آپؐ نے سوال فرمایا :

تم ایمان کے کس درجے میں ہو؟

تو انہوں نے عرض کی

"ہم مومن ہیں"

البتہ ان کا ایمان اصولاً واضح تھا کیونکہ انہوں نے آپؐ کو یا رسول اللہؐ کہہ کر خطاب کیا تھا۔ لہٰذا رسولِ اکرمؐ نے ان کے درجۂ کمال کے بارے میں دریافت فرمایا :

"فما حقیقة ایمانکم"

تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

وہ کہنے لگے :

"الرضا بقضاء اللہ والتفویض الی اللہ والتسلیم لامر اللہ"

(قضائے الٰہی پر راضی ہونا (امور کو) اللہ کے سپرد کرنا اور امر الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔)

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"علماء حکماء کادوا ان یکونوا من الحکمۃ انبیاء ان کنتم صادقین فلا تبنوا ما لا تسکنون ولا تجمعوا ما لا تأکلون واتقوا اللہ الذی الیہ ترجعون"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر تم ایسے علماء و حکماء ہو کہ فرطِ حکمت کے باعث سرحدِ نبوت کے قریب ہو گئے ہو کیونکہ انبیاء رضا و تسلیم کے مقام کامل پر فائز ہوتے ہیں اگر تم نے اس مقام کی طرف سبیل پالی تو زہد، قناعت اور پرہیز گاری جیسے اعمالِ صالحہ کے ذریعے اس کی حفاظت کرو۔ ممکن ہے بعض اوقات کسی خاص حالت میں انسان کو اپنے اندر انقطاع[1] کی کیفیت کا ہلکا سا احساس ہو مثلاً کسی جنازہ کو دیکھ کر یا قبورِ مومنین کی زیارت کے موقع پر یا ایک شہید کی شہادت کے بعد کے مناظر کو دیکھ کر کوئی خاص ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کیفیت کی حفاظت بہت مشکل ہوتی ہے دوسرے الفاظ میں اخلاقی کمالات کی ایسی حالت کو پیدا کرنا تو آسان ہے لیکن ریاضت اور مجاہدہ کے بغیر اس حالت کو ملکہ میں تبدیل کرنا میسر نہیں لہٰذا کبھی بہ اندازِ اثبات "اھدنا الصراط المستقیم" کہہ کر اور کبھی بہ کیفیت سلب "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا"[2] کہہ کر ہمیشہ اس کے بقاء کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

[1] "انقطاع" منقطع ہونا سے ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ دنیا اور اس کے مادی رنگ و کیف سے منقطع ہو جانا اور اپنے دل کو مالکِ حقیقی سے وابستہ کر لینا (مترجم)

[2] آلِ عمران ۔ ۸

فرمایا:

"اگر تم سچ کہتے ہو تو اپنی احتیاج سے زیادہ تعمیرات میں نہ پڑنا اور اپنے توشہ سے زیادہ ذخیرہ اندوزی نہ کرنا اور اس خدا سے ڈرنا کہ جس کی طرف تمہیں لوٹ جانا ہے"

روایت میں مسکن کا ذکر کچھ اس طرح سے آیا ہے کہ دیگر ادلہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی حاجت سے زیادہ منزل پہ منزل بناتا چلا جائے تو ایک فرشتہ اسے کہتا ہے:

"این ترید یا فاسق"[1]

(اے فاسق! کہاں کا ارادہ ہے؟)

خوفِ عقلی اور خوفِ نفسی:

مندرجہ بالا حدیث کا آخری جملہ یہ ہے "واتقوا اللہ الذی الیہ ترجعون" اور اس خدا سے ڈریں جس کی طرف تمہیں لوٹ جانا ہے) کبھی بات کو اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ "فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ"[2] (پس اس آگ سے ڈرو کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں) اور کبھی یوں فرمایا جاتا ہے "واتقوا اللہ الذی الیہ ترجعون" یہاں تقویٰ سے مراد خوفِ عقلی ہے نہ کہ خوفِ نفسی۔ اگرچہ جہنم کا خوف بھی ایک کمال ہے لیکن یہ خوف خوفِ نفسانی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ سے خوف ایک برتر کمال اور عقلی خوف ہے مثلاً مقام عصمت سے آگاہ ایک انسان جب کسی معصوم سلام اللہ علیہ کے حرم میں داخل ہوتا ہے تو نہایت احترام و ادب سے داخل ہوتا ہے اور معصوم سلام اللہ علیہ کی عظمت و جلال سے مرعوب ہوتا ہے اور اپنے آپ میں احساسِ حقارت کرتا ہے۔ یہ خوفِ عقلی ہے البتہ جب وہ آگ یا اس جیسی

---

[1] فروع کافی ج ۶ باب تشیید البنا حدیث ایک۔ [2] بقرہ - ۲۴

چیزوں سے ڈرتے ہوئے ان سے دور ہوتا ہے تو یہ خوف ایک نفسانی خوف ہے قرآن کریم میں مذکور تمام خوف ایک جیسے نہیں ہیں کہیں جہنم کے ڈر کا ذکر ہے اور کہیں مقام الٰہی کے خوف کا، مثلاً کہیں فرمایا گیا ہے " واتقوا النار " اور کہیں ارشاد ہوتا ہے " ولمن خاف مقام ربه جنتان " (رحمٰن - ۴۶)

مختصر یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قافلے والوں کو مذکورہ حکم دیا۔ رہا یہ سوال کہ وہ قافلے والے تھے کون؟ کیا واقعاً خارج میں کوئی قافلہ تھا یا مراد سالکان الی اللہ ہیں؛ کوئی صورت بھی ہو مقصود میں فرق نہیں پڑتا۔ دوسری روایت اسحاق بن عمار سے منقول ہے کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ سے سنا آپ نے رسولِ اکرمؐ کے بارے میں فرمایا:

" صلی بالناس الصبح فنظر الی شاب فی المسجد وهو يخفق ويهوی برأسه مصفرًا لونه قد نحف جسمه وغارت عيناه فی رأسه "

ایک روز رسول اللہؐ نے صبح کی نماز باجماعت کے بعد مسجد میں دیکھا کہ ایک جوان کی حالت ایسے ہے جیسے وہ رات بھر نہ سویا ہو اس کا جسم نحیف ہو چکا تھا اور رخسار زرد پڑ چکے تھے اس کی آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں۔

" فقال له رسول الله (ص) کیف اصبحت یا فلان "

رسول اللہؐ نے اس کا حال پوچھتے ہوئے کہا کہ تم نے کیسے صبح کی؟

" قال اصبحت یا رسول الله موقنًا "

کہنے لگا یا رسولؐ اللہ میں نے حالتِ یقین میں صبح کی۔

یہ کوئی عام قسم کے سوالات اور احوال پرسی نہ تھی بلکہ یہ اس طرح کے سوالات تھے جیسے استاد اپنے شاگردوں سے کرتا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ کلینی مرحوم نے " روضۃ الکافی " میں نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ کبھی کبھی اپنے صحابہ سے پوچھا کرتے تھے " کل رات تم نے خواب میں کیا دیکھا؛ اس لیے کہ رویاء صالحہ نبوت کا ایک جزء

ہیں اور ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہیں لہٰذا آپ ایک آگاہ مربی کی طرح اپنے شاگردوں سے یہ سوال کرتے اور اس طرح سے انہیں پاکیزگیٔ روح اور تہذیبِ نفس کی ہدایت کرتے تاکہ وہ رویاءِ صالحہ بھی دیکھیں۔ بہر حال آپؐ نے اس جوان سے پوچھا کہ تم نے کیسے صبح کی اس نے عرض کی کہ میں مقامِ یقین تک پہنچ گیا ہوں۔

"فعجب رسول اللہ من قولہ"

رسول اللہؐ کو اس جوان کے جواب پر تعجب ہوا۔

یہاں اس امر کی طرف توجہ کیجئے کہ جنہوں نے کہا تھا کہ ہم مقامِ ایمان تک پہنچ گئے ہیں تعجب نہیں فرمایا جب کہ اس شخص کے جواب پر تعجب فرمایا کہ جس نے کہا کہ میں مقامِ یقین تک پہنچ گیا ہوں اس پر آپؐ نے اس سے کہا:

"ان لکلّ یقین حقیقۃً فما حقیقۃ یقینک"

یعنی ہر چیز کی ایک حدو حقیقت ہے یقین بھی ایسا ہی ہے تمہارے یقین کی حقیقت کیا ہے؟ فقال ان یقینی یارسول اللہ ھو الذی احزننی و اسھر لیلی و اظمأ ھواجرنی"

یعنی میرے یقین کا عالم یہ ہے یا رسولؐ اللہ کہ وہ مجھے ہمیشہ غمگین رکھتا ہے چونکہ جسے میں چاہتا ہوں وہ میری دسترس میں نہیں اور جو میری دسترس میں ہے وہ میرا مطلوب نہیں میں اس پر غمزدہ ہوں لہٰذا راتوں کو مجھے نیند نہیں آتی اور گرم دن میرے تشنگی میں گزرتے ہیں۔ یہ اس امر کے لیے کنایہ ہے کہ دن کو روزہ رکھتا ہوں اور میری رات عبادت میں بسر ہوتی ہے۔ وہ مزید کہتا ہے:

"فعزفت نفسی عن الدّنیا و ما فیھا"

"عزوف" "عزوب" کے معنی میں ہے یعنی میں نے دنیا کو طلاق دے دی ہے میرا نفس دنیا سے بیزار ہے خلقِ خدا سے بیزار نہیں اور نہ ہی رضائے الٰہی اور لوگوں کی خدمت کے کاموں سے۔ دنیا سے کنارہ کشی پسندیدہ ہے۔ لیکن مخلوق سے دوری اور رضائے الٰہی کے لیئے خدمتِ خلق سے چشم پوشی ناپسندیدہ اور مذموم ہے۔

اس جوان نے مزید عرض کیا:

"حتّٰی کانّی انظر الی عرش ربّی"

(یہاں تک کہ ایسا ہے گویا میں اپنے رب کا عرش دیکھ رہا ہوں)

رسول اللہؐ کے حضور یہ ایک اِدّعا تھا۔ اللہ کا وہ مقامِ فرمانروائی کہ جہاں سے تمام احکامات صادر ہوتے ہیں، اسے عرش کہتے ہیں۔ اس جوان کا دل چونکہ عرشِ الٰہی تھا "قلب المومن عرش الرحمٰن"۔ گویا وہ اس کا نظارہ کر رہا تھا۔ وہ جوان مزید کہتا ہے:

"وقد نصب للحساب وحشر الخلائق لذٰلك"

(ایسا ہے جیسے میزانِ حساب نصب کر دیا گیا ہو اور مخلوقات کو اس کے لیے حاضر کر دیا گیا ہو۔)

یعنی وہی عرش قیامت میں تختِ فرمانروائی اور مقامِ عدل کی صورت میں ظہور کرے گا۔ وہ کہتا ہے کہ گویا سب لوگوں کو حشر کے لیے زندہ کر دیا گیا ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ:

"ان الاوّلین والآخرین لمجموعون الٰی میقات یوم المعلوم"

اولین اور آخرین ایک یومِ معلوم کے مقرر وقت پر جمع ہیں۔ (واقعہ ۴۹-۵۰)

"وانا فیھم"

اور میں ان میں ہوں۔

"وکانّی انظر الی اھل الجنّة یتنعّمون فی الجنّة و یتعارفون وعلی الارائك متکئون"۔

اور گویا میں اہلِ جنت کو نعماتِ جنت سے بہرہ مند ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ وہ تکیے لگائے بیٹھے ہیں اور اللہ کی خاص نعمات انہیں حاصل ہیں اور وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی ہیں۔

"وکانّی انظر الی اھل النار وھم فیھا معذّبون مصطرخون"

گویا میں اہلِ نار کو بھی دیکھ رہا ہوں کہ انہیں آتشِ جہنم میں عذاب دیا جا رہا ہے اور وہ واویلا کر رہے ہیں۔

"وکانّی الآن اسمع زفیر النّار یدور فی مسامعی"

گویا میں اس وقت آگ کے جوش و خروش کو سن رہا ہوں اور اس کا شور میرے کانوں میں گونج رہا ہے:

"فقال رسول اللہ لاصحابہ: ھٰذا عبد نوّر اللہ قلبہ بالایمان"

اس پر رسولؐ اللہ نے فرمایا: یہ وہ بندہ ہے کہ جس کے دل کو اللہ نے نورِ ایمان سے روشن کر دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نورانی ہونے کا مرحلہ عبودیت سے ہی شروع ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے جملے میں پہلے عبد کا ذکر کیا ہے پھر آپؐ نے اس جوان سے کہا:

"الزم ما انت علیہ"

یعنی اسی راہ پر ثابت قدم رہنا کیونکہ اس مقام کی حفاظت اس کے حصول سے دشوار تر ہے یہی وجہ ہے کہ ایک دعا میں آیا ہے۔

"ولا تنزع عنّی صالح ما اعطیتنی"

اور مجھ سے وہ خوبی واپس نہ لے جو تو نے مجھے عطا کی ہے

اس پر وہ جوان کہنے لگا:

"ادع اللہ لی یا رسول اللہ ان ارزق الشّھادۃ معک"

یا رسول اللہؐ! اللہ سے دعا کیجئے کہ مجھے آپؐ کی رکاب میں شہادت نصیب ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حفظِ اسلام اور حکومتِ اسلامی کے استحکام کے لیے جنگ کرنا امورِ دنیا میں سے نہیں کیونکہ وہ جوان دنیا کو چھوڑ چکا تھا اور اس سے بالکل بیزار تھا کیونکہ یہ وہی شخص ہے کہ جس کے بارے میں رسولؐ اللہ نے فرمایا "ھذا عبدٌ نوّر اللہ قلبہ بالایمان"، اس کا یہ عرض کرنا کہ میرے لیے دعا کریں کہ میں آپؐ کے رکاب میں شہید ہوں ظاہر کرتا ہے کہ ترکِ دنیا ایک اور چیز ہے اور استحکامِ حکومتِ اسلامی کے لیے قتال کا ترک کرنا اور چیز ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرتِ امیر علیہ السلام جنگِ جمل میں کامیابی کے بعد جب بصرہ کے بیت المال میں داخل ہوئے تو فرمایا کہ میں دنیا کو طلاق دے چکا ہوں جب کہ آپؑ کی تلوار سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے لہٰذا دنیا کو طلاق دینے

کا معنی یہ نہیں کہ انسان گوشہ نشین ہو جائے۔ اس وقت بھی کہ جب خلافتِ الٰہی کا حق مسلّم آپؑ سے چھن چکا تھا اور کھیتی باڑی کیا کرتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ میں دنیا کو طلاق دے چکا ہوں اور جب ملک کی باگ ڈور آپؑ کے ہاتھ میں تھی یہی بات دہرایا کرتے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکِ دنیا سے مراد دنیا سے دلبستگی سے پرہیز ہے۔

اس جوان کی اس دعا کی خواہش کے جواب میں رسولؐ اللہ نے اس کے لیے دعا فرمائی۔ اس کے بعد وہ شخص آپؐ کے ہمراہ ایک غزوہ میں شریک ہوا تو اس میں نو افراد کی شہادت کے بعد دسواں شہید یہی جوان تھا۔

تیسری روایت عبداللہ بن مسکان سے ہے وہ ابی بصیر سے اور وہ امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

" استقبل رسول الله حارثة بن مالك بن النعمان الانصاري فقال له كيف انت يا حارثة بن مالك "

رسول اللہ نے خود حارثہ بن مالک کی طرف رخ کیا اور فرمایا: تم کس حال میں ہو؟ وہ کہنے لگے:

" يا رسول الله مؤمن حقاً "

عام لوگوں کے پاس پہنچتے تو اس طرح سے سوال نہ فرمایا کرتے لیکن جب شاگردانِ خاص کے پاس جایا کرتے تو پوچھتے تم کس حد تک پہنچے ہو؟ تم نے جو سفر شروع کیا تھا تو اب کہاں ہو؟ حارثہ سے بھی یونہی دریافت فرمایا۔ انہوں نے عرض کی "مؤمن حقاً"، تو رسول اللہ نے مزید پوچھا:

" لكلّ شيء حقيقة فما حقيقة قولك "

یعنی ہر چیز کی کوئی بنیاد اور حد ہوتی ہے تمہاری حقیقتِ ایمان کی علامت کیا ہے؟

وہ کہنے لگے:

"یا رسول اللہ! عزفت نفسی عن الدنیا"

یا رسول اللہ! میرا نفس دنیا سے دوری اختیار کر چکا ہے۔

"فاسھرت لیلی واظمأت ھواجری"

میں راتوں کو جاگتا ہوں اور دن پیاسا بسر کرتا ہوں۔

"وکانی انظر الیٰ عرش الرحمٰن وقد وضع للحساب"

یعنی گویا میں رحمٰن کا تختِ فرمانروائی کہ جو وسیع حساب کے لیے قیامت میں ظاہر ہوگا اسے دیکھ رہا ہوں اور وہ گویا حساب کے لیے بچھ چکا ہے اور لوگ حاضر کیے جا چکے ہیں۔

"وکانی انظر الیٰ اھل الجنۃ یتزاورون فی الجنۃ"

گویا میں اہلِ جنت کو دیکھ رہا ہوں کہ جو بہشت میں ایک دوسرے کی زیارت کر رہے ہیں۔

"وکانی اسمع عواء اھل النار فی النار"

اور گویا میں جہنم میں سگانِ جہنم کا شور سن رہا ہوں۔

البتہ وہ لوگ جو اس مرحلے سے آگے بڑھ چکے ہیں، ان کے لئے پھر "کانّ" نہیں بلکہ "انّ" ہے یعنی وہ بھی سنتے ہیں اور ابھی ہی دیکھتے ہیں، جیسا کہ مبداء کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے اس طرح سے منقول ہے کہ فرمایا:

"ما کنت اعبد ربًّا لم ارہ"[1]

میں ایسے رب کی عبادت و پرستش نہیں کرتا کہ جسے میں دیکھتا نہ ہوں۔

اور معاد کے بارے میں آپؑ نے یوں فرمایا:

"لو کُشِفَ الغطاء ما ازددت یقینًا"[2]

اگر پردے ہٹ جائیں تو بھی میرے یقین میں کچھ اضافہ نہ ہو۔

کیونکہ بہشت و جہنم ابھی موجود ہیں اور بعض لوگ ابھی سے ان میں مستقر ہیں۔ رسولِ خدا نے فرمایا "عبد نوّر اللّٰہ قلبہ" (یہ ایسا بندہ ہے کہ خدا نے جس کے دل کو نورانی کر دیا ہے)۔

---

[1] توحید صدوق۔ باب ۸ حاجی الرویہ، حدیث ۶۔ [2] صد کلمہ جاحظ۔

اس راہ کے کلی قوانین و خطوط کو حضرت امیر علیہ السلام نے خطبہ ہمام میں بیان فرمایا ہے کہ:

"ھم والجنۃ کمن قد راٰھا..... وھم والنار کمن قد راٰھا"

(گویا وہ جنت کو دیکھ رہے ہیں ...... اور گویا وہ آتش جہنم کو دیکھ رہے ہیں)۔

روایات میں ان کے مصادیق کو مشخص کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت نے فرمایا: "عبد نور اللہ قلبہ" معلوم ہوتا ہے کہ مقامِ ولایت تک پہنچنا راہِ عبودیت سے ہی ممکن ہے اور وہ بھی معرفت و اخلاص کے ساتھ۔ "ابصرت فاثبت" تم بصیر و بینا ہو گئے ہو لہٰذا ثابت قدم رہنا اور اس حال کو محفوظ رکھنا۔ انہوں نے یہ جو کہا "ادع اللہ لی ان یرزقنی الشھادۃ معک" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں انسان جو چیزیں دیکھتا ہے ان میں سے ایک شہادت کی کامیابی ہے۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا:

"اللّٰھم ارزق حارثۃ الشھادۃ"

خدایا حارثہ کو رزقِ شہادت عطا فرما۔

اس کے بعد ابھی چند ہی دن گزرے تھے رسول اللہ کسی سریہ پر تشریف لے گئے حارثہ بھی اس میں موجود تھے انہوں نے اس میں جنگ کی۔ نو یا آٹھ افراد کو قتل کیا اور پھر خود شہید ہو گئے۔ اس روایت کا گزشتہ روایت سے فرق یہ ہے کہ وہاں غزوہ کا ذکر تھا اور یہاں سریہ کا۔ لہٰذا وہ جوان حارثہ بن مالک سے مختلف تھا مگر یہ کہ غزوہ سریہ سے اعم ہو اور اس جوان سے مراد حارثہ بن مالک ہی ہوں۔

اخلاص ــــ اقوالِ معصومینؑ میں

بہر حال اس طرح کی روایات سے پتا چلتا ہے کہ یقین ہی انسان کو اس بلند مقام تک پہنچاتا ہے۔ اخلاص کے بارے میں دیگر روایات کو بھی کلینی مرحوم

نے بابِ اخلاص[1] میں ذکر کیا ہے کہ جو فریضے اور اصلِ دوم پر دلالت کرتی ہیں۔ اس باب کی پہلی روایت میں "حنیفاً مسلماً" کو "خالصاً مخلصاً لیس فیہ شیٔ من عبادۃ الاوثان[2]" سے تفسیر کیا گیا ہے۔

روایتِ دوم میں یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یاایھا الناس انما ھو اللہ والشیطان، والحق والباطل، والھدیٰ والضلالۃ، والرشد والغیّ، والعاجلۃ والآجلہ والعاقبۃ و الحسنات والسیئات، فما کان من حسنات فللہ وما کان من سیئات فللشیطان لعنہ اللہ"

اے لوگو! بیشک اللہ اور شیطان، حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی، عروج اور تنزل، دنیا اور آخرت، نیکی اور بدی سب موجود ہیں پس جو اچھائی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی ہے وہ شیطان لعنۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہے۔

تیسری روایت امام رضا سلام اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں کہ "انّ امیرالمومنین صلوات اللہ علیہ کان یقول" (امیرالمومنین صلوات اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے) "کان یقول" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؑ یہ بات بار بار تکرار کیا کرتے تھے کہ:

"طوبیٰ لمن اخلص للہ العبادۃ والدعاء ولم یشغل قلبہ بما تریٰ عیناہ ولم ینس ذکر اللہ بما تسمع اذناہ ولم یحزن صدرہ بما اعطی غیرہ"

یعنی درختِ طوبیٰ (پاکیزہ) یا باسعادت زندگی اس شخص کے لیے مختص ہے کہ جو عبادت و دعا کو مخلصانہ بجالائے اور جو کچھ وہ آنکھ سے دیکھتا ہے اس کا دل اسی میں مشغول نہ ہو جائے اور جو کچھ کانوں سے سنتا ہے وہ اسے

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۱۵۔ [2] ترجمہ "یعنی خالص اور مخلص ہو اور بتوں کی پرستش کا ذرا بھی خیال اس کے دل میں نہ ہو"

یادِ خدا سے باز نہ رکھے اور جو کچھ دوسروں کے پاس ہے اور اس کے پاس نہیں ہے وہ اسے غمزدہ نہ کر دے۔

کیونکہ مال و دولت اور عیش و عشرت کے دوسرے امکانات باعثِ عزت و تکریم نہیں بلکہ وسیلۂ امتحان ہیں اور اگر کسی کی یہ حالت ہو کہ عالمِ طبیعت نے اس کا دل اپنی طرف نہ لگا لیا ہو اور اسے یادِ خدا سے روک نہ لیا ہو تو وہ اخلاص سے بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

والحمد للہ رب العالمین

○

درس ۱۰

گذشتہ بحث کا اہم حصہ ولایت کے مبداء فاعلی کی شناخت کے بارے میں تھا۔ (الولایۃ لِمَ ھی؟) کیونکہ یہ معرفت انسان کو ولایت کے مقامِ بالا تک پہنچنے کے لیئے راہنمائی کرتی ہے اور "ولی اللہ" بننے کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ اس سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر کوئی ایسا عمل قصدِ قربت سے انجام دیا جائے کہ جو فی نفسہٖ تقرب کی صلاحیت رکھتا ہو اور اسے بجالاتے ہوئے حسنِ فعلی اور حسنِ فاعلی دونوں کا لحاظ رکھا جائے تو انسان ولایتِ الٰہی کا بلند مقام پالے گا۔ اسی طرح یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ معرفت و اخلاص راہِ ولایت کے واجبات میں سے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ انسان کے دو پہلو ہیں: وہ عقلِ نظری کا بھی حامل ہے اور عقلِ عملی کا بھی۔ عقلِ نظری کے ذریعے سے وہ معاملات کی درستی اور نادرستی کو پہچانتا ہے اور عقلِ عملی کے ذریعے سے جو کام اسے انجام دینا چاہیئے اسے بجا لاتا ہے اور جس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے اس سے اجتناب کرتا ہے۔ عقلِ نظری کا کمال شناختِ خدا سے عبارت ہے اور عقلِ عملی کا کمال اللہ کے لیئے اخلاصِ عمل کا نام ہے۔ لہٰذا یہ دو امر فرائضِ ولایت میں سے شمار ہوتے ہیں۔

اصالتِ معرفت

البتہ اس امر کی طرف توجہ رہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے عرض میں یعنی مدِ مقابل نہیں ہیں بلکہ معرفت اگر جڑ ہے تو اخلاص اس کی شاخ ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ بغیر معرفت کے اخلاص پیدا ہو جائے۔ پس معرفت کا اثر تا ابد رہتا ہے اور اخلاص کا اثر موت کے ساتھ تمام ہو جاتا ہے، کیونکہ انسان جب اس دنیا سے چل بستا ہے تو عمل کا سلسلہ اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ اخلاص سمیت منقطع ہو جاتا ہے۔

لیکن بعد ازاں معرفت پھلتی پھولتی ہے اگرچہ ثمرۂ عمل اور نتیجۂ اخلاص بھی ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

صمدیّت ۔ سرچشمۂ ولایت

بہرحال انسان کے ولی اللہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا درون معرفت و اخلاص سے معمور ہو تاکہ وہ صمد کے نامِ مبارک کا مظہر ہو اور پھر ولی کہ جو حق تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک نام والا ہے اس میں تجلّی کرے کیونکہ ولایتِ الٰہی کا سرچشمہ حق تعالےٰ کی صمدیت ہے اور خدائے سبحان چونکہ صمد ہے، ولی بھی ایسا ہی ہے۔ صمد کا معنی ہے ایک ایسی ذات کہ جو اندر سے خالی اور کھوکھلی نہیں ہے بلکہ اس کا درون پُر ہے۔ وہ لوگ کہ جو خدائے صمد کے مظہر ہو جاتے ہیں قرآن کریم انہیں "اولوالالباب" کے نام سے یاد کرتا ہے یعنی مغز رکھنے والے انسان، جب کہ ان کے مقابل جو لوگ ہیں وہ تہی مغز ہیں، جن کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

"افئدتھم ھواء" (ابراہیم - ۴۳)

یعنی ان کے قلب تہی ہیں۔ بعض لوگ اس لیے تہی مغز ہو جاتے ہیں کہ شیطان ان کی فکر و معرفت میں بھی نفوذ پیدا کر لیتا ہے اور ان کے عمل میں بھی۔ لہٰذا ان کا عمل خالص ہوتا ہے نہ ان کی فکر و معرفت بُرہانی و شہودی ہوتی ہے بتیجتاً وہ عمل میں مظہرِ صمد ہوتے ہیں نہ علم میں۔ جن لوگوں کی معرفت اور فکر میں وہم و خیال نے رخنہ اندازی نہیں کی ہوتی اور انہیں اندر سے کھوکھلا نہیں کر دیا ہوتا وہ معرفت کی جہت سے "لبیب" ہوتے ہیں لہٰذا عمل میں بھی وہ مخلص ہوتے ہیں یا مخلَص۔ دوسرے لفظوں میں وہ علم و عمل کے دو پہلوؤں میں مظہرِ صمد بن جاتے ہیں اور علم و عمل چونکہ روحِ کامل کے ہی دو پہلو ہیں لہٰذا ان کی روح مظہرِ صمد ہو جاتی ہے اور جو روح جس قدر مظہرِ صمد ہو اسی قدر مظہرِ ولی ہو سکتی ہے۔

صمدیتِ انسان کے مراتب: بعض اوقات انسان صمد ہونے کے لیے

مرحلے میں ہوتا ہے کہ اسے فقط اپنے عمل کو شیطان کی دستبرد سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی ولایت فقط اپنے آپ پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس سے بالاتر مرحلہ ہوتا ہے کہ جس میں نہ فقط اپنے حریم دل کی حفاظت کرنا ہوتی ہے بلکہ اپنی معرفت و اخلاص کی بھی نگہبانی کرنا ہوتی ہے اور افقِ روح سے شہابِ ثاقب کی طرح شیاطین کو دور بھگانا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی حدودِ ولایت بھی وسیع تر ہوتی ہیں۔ اس سے بالاتر انسانِ کامل کا مقام ہے کہ جو اللہ تعالےٰ کی صمدیت کا مظہرِ تام ہوتا ہے اور نتیجتاً اذنِ الٰہی سے تدبیرِ عالم اپنے ذمہ لیتا ہے۔

معرفت کے مرحلے میں صمدیت کی رکاوٹیں

معرفت کے پہلو میں وہی انسان مظہرِ صمد بن سکتا ہے جو اپنی عقل کے راستے سے داخلی اور خارجی رکاوٹیں دور کرلے۔ داخلی رکاوٹیں وہم و خیال سے عبارت ہیں ضروری ہے کہ عقل ان کے شائبہ سے بھی محفوظ ہو اس طرح سے کہ استدلال کے موقع پر وہم و خیال فقط مقدمات فراہم کرکے انہیں عقل کی تحویل میں دے دیں لیکن مقدمات کو نظم دینا اور ان سے نتیجہ اخذ کرنا عقل کے ذمہ ہو کیونکہ وہم و خیال نے اگر عقل کے کام میں کچھ بھی مداخلت کی تو اسی قدر نتیجہ حقیقت سے تہی ہوگا لہٰذا اس حوالے سے انسان مظہرِ صمد نہ ہوگا۔ وہم کی کمزوری یہ ہے کہ وہ مقدمے کو قبول کرلیتا ہے لیکن نتیجے کو قبول نہیں کرتا۔ تنہائی اور ظلمت سے خوف اسی قبیل سے ہے کیونکہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیا در و دیوار یا کتاب یا زندگی کی دوسری ضروریات انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں، تو وہ نفی میں جواب دے گا لیکن ایک کمرے میں وہ تنہا ہو تو ڈرتا ہے اس ڈر کا سرچشمہ وہم ہی ہے جو مقدمات میں موجود ہے۔ یہی وہم ہے جو اخذِ نتیجہ کے موقع پر عقل کے کام میں مداخلت کرتا ہے۔ خارجی رکاوٹیں بھی شیاطین ہیں جو داخلی دشمنوں کے تعاون سے مغالطے اور وسوسے کے ذریعے سے فہمِ حقائق میں حائل ہوتے ہیں۔ سورۂ مبارکہ انعام میں مشرکین کے طرزِ تفکر کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"انّ الشّیاطین لیوحون الیٰ اولیاءھم لیجادلوکم وان اطعتموھم انکم لمشرکون" (انعام-۱۲۱)۔

یعنی شیاطین اپنے اولیاء کو وحی کرتے ہیں کہ وہ تم سے جدال کریں لہٰذا وہ مشرکین جو قرآن کے خلاف مجادلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ان کی فکر کا حاصل وحیٔ شیطان ہے وحی داخلی شعورِ مرموز سے عبارت ہے جو کبھی مسائلِ فکری میں عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی ارادے کی صورت میں مسائلِ عملی میں ظہور کرتی ہے۔

عمل کے مرحلے میں صمدیت کی رکاوٹیں

عمل کے پہلو سے بھی وہی انسان مظہرِ صمد بن کر نتیجتاً مظہرِ ولی بن سکتا ہے جو اپنے راستے سے وہ رکاوٹیں دور کردے جو حصولِ ولایت میں پیش آتی ہیں۔ قبحِ فعلی اور قبحِ فاعلی دونوں ولایت کے راستے کی رکاوٹیں شمار ہوتی ہیں۔ ہر ایسے عمل کی انجام دہی مانعِ ولایت ہے جو فی نفسہٖ مبعد یعنی دوری کا باعث ہو یا ہو تو مقرب (قرب کنندہ) لیکن کرنے والا اسے غیرِ خدا کے لیے انجام دے ایسا فعل نہ فقط انسان کو ولایتِ الٰہی کی منزل تک نہیں پہنچاتا بلکہ اسے عداوتِ حق کے دام میں پھنسا دیتا ہے کیونکہ انسان دو حالتوں سے باہر نہیں ہو سکتا یا وہ ولی اللہ ہے یا عدو اللہ اور اگر وہ ولایتِ الٰہی کے کسی مرحلے میں نہ ہو تو عداوتِ الٰہی اسے آلے گی۔

اعمال کی فوری جزا

سورۂ مطففین میں قرآنِ کریم نے گناہ کو شہودِ حقائق کی رکاوٹ شمار کیا ہے اور خبردار کیا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ گناہ کسی دفتر میں لکھ لیا جائے گا اور پھر مستقبل قریب یا بعید میں انسان کے لئے باعثِ سزا ہوگا۔ بلکہ گناہ کی سزا نقد ہے یہی ایک آیت نہیں بلکہ وہ تمام آیات جو جزا کو عمل کے مطابق قرار دیتی ہیں عالمِ آخرت اور جہنم سے مختص نہیں اگرچہ ان میں سے بعض ایسی آیات کے درمیان موجود ہیں جن میں جہنم کا

تذکرہ ہے لیکن نہ تو سیاق و سباق انہیں مختص قرار دیتا ہے اور نہ موضوع و مورد۔
یہ ایک کلی اصول ہے کہ اللہ تعالےٰ جزا دیتا ہے اور جزا بھی عمل کے سوا نہیں۔
لہٰذا یہ جزا اور کیفر عمل کے ساتھ شروع ہو جاتی ہیں۔ قرآن ارشاد فرماتا ہے:

" اذا تتلیٰ علیه اٰیاتنا قال اساطیر الاوّلین " (مطففین-۱۳)

یعنی آیاتِ الٰہی جب کسی ایسے شخص کے سامنے تلاوت کی جائیں جو منکرِ قیامت ہو تو وہ کہتا ہے کہ یہ سب گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں۔ قرآن کریم جواب میں فرماتا ہے کہ یہ ہرگز افسانے نہیں بلکہ الٰہی حکمتیں ہیں، نقص تو اس میں ہے کہ جو سمجھتا نہیں اور اس کج اندیشی کا سبب وہ زنگ ہے جو گناہ کے باعث اس کے صفحۂ دل کو سیاہ کر چکا ہے:

" بل رانَ علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون " (مطففین-۱۴)

" رین " یعنی پیپ، " ران " یعنی اس میں پیپ بھر گئی۔ آیۂ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ جو دل ہم نے اسے عطا کیا تھا وہ آئینے کی مانند شفاف تھا اگر یہ اسے تباہ و سیاہ نہ کرتا تو اسرارِ عالم اس میں منعکس ہوتے لیکن اس نے گناہ کے ذریعے اس آئینے کو تیرہ و تار کر لیا ہے، جیسے تقویٰ آئینۂ دل کے لیے باعثِ صفاء و شفافیت ہے:

" ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقانا "

اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہیں حق و باطل میں تمیز عطا کرے گا۔

(انفال-۲۹)

گناہ بھی دل کے لیے " رین " ہے اور نورِ معارفِ الٰہی کے لیے رکاوٹ ہے اور یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے فوری اور نقد سزا ہے۔

البتہ گناہ مختلف ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی عمل فی نفسہٖ معصیت ہو جیسے غیبت اور جھوٹ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی عمل فی نفسہٖ معصیت نہ ہو لیکن انجام دہندہ اسے غیر اللہ کے لیے بجا لائے، جیسے دکھاوے کی نماز۔ دونوں " رین " کی ہی مختلف صورتیں ہیں اور جو چیز " رین " سے بھر جائے وہ حق سے خالی ہو گی۔ نتیجتاً ایسا شخص اس گروہ میں

داخل ہو جائے گا کہ " افتہ تہو اہ " اور جب کسی کا دل تہی دامن ہو جائے تو وہ ہرگز مظہرِ صمد و ولی نہ ہوگا۔ لہٰذا شیطان اسے اپنی ولایت میں لے گا۔ نیز ممکن ہے وہ ایک عمر ولایتِ شیطان کے ماتحت رہے اور اسے خبر نہ ہو۔ سورہ مبارکہ محمدؐ میں یوں فرمایا گیا ہے :

" أفلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالُها "
(کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا پھر ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں)
(محمد - ۲۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات دل مقفل ہو جاتے ہیں۔ قفلِ دل معصیت ہی ہے جو معارف کو اس میں جانے نہیں دیتی۔ نتیجتاً ایسا دل وہم، خیال، مغالطہ اور فکرِ باطل کی جولان گاہ بن جاتا ہے۔ اسی حال میں اگر وہ اس دارِ فانی سے چل بسے تو روزِ قیامت تہی دل اور فقیر محشور ہوگا کیونکہ ایک طرف وہ حقیقی چہرہ آشکار ہو جائے کہ جس نے اس عالمِ طبیعت میں خیالات و اوہام جمع کر رکھے تھے کیونکہ وہ ظہورِ حقائق کا عالم ہوگا اور اس دن وہ سمجھے گا کہ دنیا میں اس نے سراب سے دل لگا رکھا تھا اور معرفت کے ابلتے ہوئے سرچشمۂ شیریں سے بے بہرہ و محروم رہا ہے اور دوسری طرف قیامت علوم و معارف کے حصول کا مقام بھی نہیں کہ جہاں جاہل تحصیلِ کمال کی جستجو کر سکے۔

اتمامِ حجت :

ایسے افراد کے لیے ایک اور نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ فرمایا گیا ہے : " ان گناہگاروں کے دلوں پر معارفِ قرآن پیش کیے جاتے ہیں لیکن وہ قبول نہیں کرتے۔" معرفت و آگاہی کے نقطۂ نظر سے انسان میں ادراک کی بہت سی قوتیں موجود ہیں جیسا کہ عمل کے لحاظ سے بھی اس میں بہت سے میلانات پائے جاتے ہیں۔ حس، وہم، خیال اور عقل کا تعلق انسان کی ادراکی قوتوں سے ہے جبکہ شہوت، محبت، ارادہ، تولّی، غضب، عداوت، کراہت، اور تبرّیٰ کا تعلق عقلِ عملی سے ہے اور یہ جذبات

تحریک کنندہ قوتوں میں سے شمار ہوتے ہیں۔ ادراک و تحرک کی یہ قوتیں انسان کے اندر موجود ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جیسے ہم زیرِ زمین پانی جاری کرتے ہیں اور تحت الارض چشمے ایجاد کرتے ہیں ان کے دلوں میں بھی علوم و معارف جاری کرتے ہیں لیکن ان کے ادراک و تحرک کی کوئی قوت انہیں قبول نہیں کرتی" سورۂ مبارکہ حجر کی آیت ۱۱ تا ۱۳ میں ہے۔

"وما یأتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون۔ کذٰلک نسلکہ فی قلوب المجرمین، لایؤمنون بہ و قد خلت سنۃ الاولین" (حجر۔ ۱۳تا۱۱)

(کوئی رسول ان کے پاس ایسا نہیں آیا جس کا انھوں نے مذاق نہ اڑایا ہو۔ اسی طرح ہم مجرموں کے دلوں میں اس (روشِ کفر) کو داخل کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور یہی اس سے پہلے گزرے ہوؤں کی روش رہی ہے۔)

"سلکہ" اور "اسلکہ" ایک ہی معنی میں ہیں۔ اگر آپ دھاگے کو سوئی کے سوراخ میں داخل کریں تو کہیں گے کہ "اسلکتہ" یا "سلکتہ" یعنی دھاگے کو میں نے اس سوراخ میں داخل کر دیا۔ قرآنِ کریم نے یہ لفظ زیرِ زمین پانی کے لیے استعمال کیا ہے۔ فرماتا ہے:

"فسلکہ ینابیع فی الارض"

(اور اسے زمین میں چشمے بنا کر بہاتا ہے۔) (زمر۔ ۲۱)

بارش کے ذریعے پانی زمین پر اتارا پھر زمین کو حکم دیا کہ اس پانی کو نگل جائے، پھر نیچے اتر جانے والے اس پانی کی راہنمائی کی تاکہ وہ خاص دراڑوں اور درزوں میں سما جائے تاکہ کہیں زیرِ زمین نالیاں بن جائیں، کہیں چشمے پھوٹ پڑیں اور کہیں کنویں بن جائیں۔

اسی طرح معارفِ قرآنی جو آبِ حیات ہیں کو انسانوں کی سرزمینِ حیات جوان

کے دِل میں میں جاری کرنے کے لیئے بھی ایسی ہی تعبیر لائی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے ان معارف کے آبِ حیات کو لوگوں کے دلوں کی سرزمین کی طرف چلایا۔ وہ دل جو رقیق ہیں فوراً اسے قبول کر لیتے ہیں لیکن بعض دل سنگِ خارا کی طرح سخت اور اثر ناپذیر ہوتے ہیں، وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ کذٰلك نسلكه فی قلوب المجرمین لا یؤمنون به ؟

مختصر یہ کہ فرماتا ہے کہ ہم اپنی آیات کو ان کے دلوں میں لے گئے معارفِ الٰہی انہیں یوں پیش کیے کہ ادراک و تحرک کے ایک ایک سوراخ تک انہیں دھاگے کی طرح پہنچایا، لیکن حق واضح ہونے کے باوجود انہوں نے قبول نہ کیا۔ لہٰذا ان کی ہلاکت اتمامِ حجت کے بعد تھی۔ "لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ" (انفال ۴۲)

اگرچہ بعض آیات میں ہے کہ آیاتِ الٰہی ان کے سامنے فقط تلاوت کی گئیں لیکن اس تعبیر کا راز یہ ہے کہ ان کے سامنے استدلال کا چونکہ کوئی فائدہ نہیں ہوا تو گویا آیاتِ الٰہی فقط ان کے کانوں سے گزری ہیں ورنہ قرآن کا اصولِ مسلم یہ ہے کہ حجتِ خدا بالغہ ہے اور حجت تبھی بالغہ اور رسا ہو سکتی ہے جب آیاتِ الٰہی دل کو پیش کی جائیں، آدمی سمجھے اور حجت اس پر تمام ہو۔ اس صورت میں اگر وہ قبول نہ کرے تو عذابِ الٰہی سے دوچار ہوگا یہ ہلاکت اتمامِ حجت کے بعد ہوگی۔

"وقد خلت سنة الاولین" کا مفہوم یہ ہے کہ یہ فقط انہی کی روش نہ تھی بلکہ تمام کج فکروں کا شیوہ رہا ہے کہ جب بھی انبیاءِ الٰہی نے انہیں آیتِ خدا پیش کی انہوں نے قبول نہ کی اور اس سے پیٹھ پھیر لی۔

اسی بات کا ذکر سورۂ مبارکہ شعرا میں اس طرح سے ہے:

"ولو نزلناه علی بعض الاعجمین فقرأه علیهم ما کانوا
به مؤمنین، کذٰلك سلکناه فی قلوب المجرمین
لا یؤمنون به حتّٰی یروا العذاب الالیم"

(شعرا - ۱۹۸ تا ۲۰۱)

یعنی اگر قرآن عجمی زبان میں ہوتا اور نبی غیر عرب ہوتا اور اللہ تعالےٰ سے کتاب حاصل کرتا اور عربوں کے سامنے پڑھتا تو ان کی خوئے عربیت تقاضا کرتی کہ اسے قبول نہ کریں لیکن اب ان کے پاس کوئی عذر نہیں۔ اب جبکہ کتاب ان کی اپنی زبان میں ہے اور اس کے بلند معانی اور معارف کو ان گناہگاروں کے دلوں کے ادراک و تحرک کے ایک ایک روزن کے سامنے ہم نے پیش کیا ہے اور ان میں سے کسی نے قبول نہیں کیا، جو دل پتھر کی طرح سخت ہو حرف اس پر اثر نہیں کیا کرتے مگر یہ کہ وہ اللہ کے دردناک عذاب کا مشاہدہ کرتے "حتّٰی یروا العذاب الالیم"

قیامت کی یاد گناہ سے بچاتی ہے

ایک عامل کتاب انسان کو گناہ سے بچاتا ہے اور اسے اخلاص کے مقام تک پہنچاتا ہے معاد کی یاد ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ کو ایک انعام عطا کیا اور وہ یہ کہ:

"انا اخلصناھم بخالصۃ" (ص - ۴۶)

وہ انعام یہ تھا کہ ہم نے انہیں مخلصین میں سے قرار دیا۔ پھر انہیں یہ مقام عطا کرنے کی وجہ بیان فرماتا ہے: بخالصۃ "کیونکہ وہ ایک امتیاز اور خصلتِ بے شائبہ کے حامل تھے اس لیے ہم نے انہیں اس مقام تک پہنچایا اور یہ امتیاز "ذکری الدار"[1] کی مانند تھا۔

"دار" یعنی گھر۔ اگر یہ لفظ بطور مطلق استعمال ہو تو اس سے مراد دنیا نہیں ہے کیونکہ اگر دار سے خاص طور سے دنیا مراد لینا ہو تو دنیا کو اس کی صفت کے طور پر لایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے "دارِ دنیا" جیسے اگر کوئی مسافر خانہ کہنا چاہے تو صرف خانہ نہیں

---

[1] ص - ۴۶

کہے گا بلکہ مسافر خانہ کہے گا لیکن اگر کوئی اپنے اصلی گھر کا ذکر کرنا چاہے تو صرف گھر کہے گا۔ قرآنِ کریم بھی آخرت کو "دار" کے نام سے یاد کرتا ہے لیکن دنیا کو "دارِ دنیا" کہتا ہے! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصلی اور دائمی گھر قیامت میں ہے اور دنیا ایک گزرگاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

مختصر یہ کہ فرماتا ہے کہ وہ چونکہ گھر کی یاد میں تھے اور قیامت پر ان کی نظر تھی اس لیے ہم نے انہیں چن لیا اور مقامِ مخلصین تک پہنچا دیا۔

نتیجۂ سخن یہ کہ گناہ انسان کی نگاہِ بصیرت کے لیے حجاب ہے اور یہ انسان کو راہِ حق اور اس کے اسرار کو دیکھنے نہیں دیتا۔ راہِ حق بہت واضح ہے۔ اس میں کوئی ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے۔ جو کوئی اس پر عمل کرے کہ جو وہ جانتا ہے تو اس پر وہ کچھ روشن ہو جائے گا جو وہ نہیں جانتا۔

"مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ كُفِيَ مَا لَمْ يَعْلَمْ"[1]

اگر کوئی یہ چاہے کہ کم از کم اپنے دائرۂ حیات میں ولی اللہ ہو جائے اور اپنے آپ کو ولایتِ شیطان سے نجات دے اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ اپنی زندگی کے ضعیف دائرۂ کار میں سہی، مظہرِ صمد ہو جائے۔

الحمد للہ رب العالمین

---

[1] ثواب الاعمال ص ۱۶۱

درس ۱۱

"قرآنِ مجید میں ولایتِ انسان" کے بارے میں بحث یہاں تک پہنچی تھی
ہ انسان اگر مظہرِ صمد بن جائے تو مقامِ ولایت تک پہنچ سکتا ہے اور انسان اس
نت مظہرِ صمد بنتا ہے جب وہ مسائلِ علمی میں بھی نفوذِ شیطان سے محفوظ رہے اور
سائلِ عملی میں بھی اس کے وسوسے سے امان میں رہے۔ اگر کسی کی فکر میں مغالطہ،
ہم اور خیال رخنہ اندازی نہ کرے تو وہ مسئلۂ معرفت میں عقل مند اور مظہرِ صمد ہے۔
ی طرح اگر اس کے عمل میں ریا کاری، بناوٹ اور خود خواہی نہ ہو تو عملی اعتبار سے
ں کا اندر معمور ہے اور وہ مظہرِ صمد۔

صمدیت کا کمال و تمامیت سے تعلق

حصولِ مفہومِ صمد میں ایک نکتہ یہ ہے کہ صمدیت تمامیت سے بھی وابستہ ہے اور کمال سے بھی۔ دوسرے لفظوں میں وہی موجود صمد ہے جو عیب سے بھی نجات پائے تاکہ تمام ہو اور نقص سے بھی نجات پائے تاکہ کامل ہو۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ عیب اور نقص میں فرق ہے۔ عیب یہ ہے کہ کوئی چیز خود اپنے اندر سے خراب ہو لیکن نقص یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہو وہ تو صحیح ہو لیکن کچھ حصے سے محروم ہو۔ مثلاً کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ قالین اس کمرے کے لیے معیب ہے اور ایسا اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب قالین عیب دار ہو مثلاً اس کا ایک حصہ بوسیدہ ہو۔ لیکن ناقص قالین وہ ہے جو کمرے میں پورا نہ آئے، چھوٹا ہو، مگر ہو صحیح۔ اگر کوئی شخص بعض مسائل کو ظاہراً جانتا ہو لیکن درحقیقت ان معلومات کے بارے میں وہم، خیال اور مغالطے کا شکار ہو تو اس کا علم معیب اور عیب دار ہے لیکن اگر کوئی جو کچھ جانتا ہے اسے صحیح جانتا ہو تاہم جتنا کچھ اسے جاننا چاہیئے نہ جانتا ہو تو اس کا علم ناقص ہے۔ لہٰذا اگر کوئی داخلی طور پر عیبِ علمی میں گرفتار

ہو یا خارجی طور پر نقصِ علمی میں مبتلا ہو تو وہ مظہرِ صمد نہ ہوگا۔

علم کی تمامیت اور کمال

اب یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ انسان کیا علمی و عملی حوالے سے مظہرِ صمد ہو سکتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا انسان میں یہ طاقت ہے کہ وہ اپنے عرصۂ علم و عمل کو عیب و نقص سے محفوظ رکھے؟ جواب یہ ہے کہ وہ ایک واقعیت جس کا علم نہیں ہوتا حق تبارک و تعالےٰ کی کنہ و حقیقتِ ذات ہے کیونکہ یہ کسی کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی کسی سے اس کی توقع ہے۔ تاہم کامل انسانوں سے جس قدر توقع ہو سکتی ہے اور جس قدر مقدور ہے اس کا راستہ کھلا ہے۔ ان دونوں باتوں کا ذکر امیرالمؤمنین سلام اللہ علیہ نہج البلاغہ میں ساتھ ساتھ یوں فرماتے ہیں:

"لم یطلع العقول علیٰ تحدید صفته ولم یحجبها عن واجب معرفته"[1]

یعنی واجب الوجود کی تحدید و حد بندی عقل کے بس کی بات نہیں لیکن ضروری حد تک عقل اس کی شناخت سے محروم بھی نہیں لہٰذا حقیقتِ ذاتِ حق کی شناخت ہماری ذمہ داری نہیں کیونکہ یہ محال ہے۔ لامتناہی وجود دائرۂ محدود میں نہیں سما سکتا تاہم جس قدر اس کا ادراک ضروری ہے اس کا راستہ کھلا ہے:

"فهو الذی تشهد له اعلام الوجود"[2]

کیونکہ علاماتِ ہستی وجودِ واجب پر گواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حق :۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ بعض ایسے لوگوں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۴۹،

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۴۹،

کی مذمت کرتا ہے جنہوں نے خدا کو ایسے نہیں پہچانا جیسے پہچاننا چاہیئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خدا کو پہچاننا چاہیئے اس کی ویسی شناخت نہ تنہا مقدور ہے بلکہ واقع بھی ہوئی ہے اور بعض نے اسے ویسے ہی پہچانا ہے جیسے پہچاننے کا حق ہے۔ اس سے مراد وہ مقدار ہے جو انسان کے مقدور میں ہے لہٰذا اسی قدر اس کی ذمہ داری ہے۔

سورۂ مبارکہ انعام کی آیت ۹۱ میں ان لوگوں کے بارے میں جو نبوت عامہ یا خاصہ کا انکار کرتے ہیں، فرمایا گیا ہے:

"وما قدروا اللہ حق قدرہ"

(جیسے خدا کو پہچاننا چاہیے تھا انہوں نے نہیں پہچانا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نے حق تعالےٰ کو اس طرح سے پہچانا ہے جو حق معرفت ہے لیکن جو لوگ نبوتِ خاصہ یا عامہ کے منکر ہیں انہوں نے ایسے نہیں پہچانا۔

"وما قدروا اللہ حق قدرہ اذ قالوا ما انزل اللہ علی بشر من شیء، قل من انزل الکتاب الذی جاء بہ موسیٰ نورًا وھدًی للناس تجعلونہ قراطیس تبدونھا و تخفون کثیرًا وعلّمتم ما لم تعلموا انتم ولا اٰباؤکم قل اللہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون"

(اور انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا اس کی قدر کرنے کا حق ہے جبکہ انہوں نے کہا: اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ کہدے: کس نے نازل کی وہ کتاب جسے موسیٰؑ لے کر آئے (اور جو) لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی تم نے اسے ورق ورق کر دیا۔ (اس میں سے) کچھ کو تو تم ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپاتے ہو اور تم وہ کچھ سکھائے گئے ہو جو تم اور تمہارے آباء نہیں جانتے تھے۔

کہدے: اللہ پھر انہیں ان کی بیکار بحثوں کے کھیل میں محو چھوڑ دے)۔

اسی سے ملتا جلتا مفہوم سورۂ مبارکہ حج کی آیت ۷۴ میں معرفتِ مبدأ اور شناختِ توحیدِ ربوبی کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"ماقدروا اللہ حق قدرہ ان اللہ لقوی عزیز"

اس کا مفہوم بھی یہ ہے کہ انہوں نے خدا کو اس طرح سے نہیں پہچانا جس طرح سے پہچاننا چاہیئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نے اللہ کو اس طرح سے پہچانا ہے جس طرح سے پہچاننا چاہیئے۔ اسی طرح سورۂ مبارکہ زمر کی آیت ۶۷ میں معاد کے بارے میں

"وما قدروا اللہ حق قدرہ والارض جمیعًا قبضتہ یوم القیامۃ والسمٰوٰت مطویّات بیمینہ، سبحانہ وتعالیٰ عمّا یشرکون"

(انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا قیامت کے دن تمام زمین اس کے قبضۂ قدرت میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے وہ بے نیاز اور بلند و برتر ہے اس سے جس کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں)۔

توحید، معاد اور نبوت چونکہ اصولِ دین ہیں اس لیے اللہ تعالےٰ ان تین آیتوں میں بعض لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ انہوں نے خدا کو ویسے نہیں پہچانا جیسے اس کی معرفت کا حق ہے کیونکہ معرفتِ خدا ہی تمام اصولِ دین کی معرفت کا سبب بنتی ہے۔

مختصر یہ کہ جس قدر انسان کے ذمہ ہے اور جو ممکن بھی ہے، اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل کرے۔ البتہ جیسے مکلفین کے درجے ہوتے ہیں اس طرح تکلیف اور ذمہ داری کے بھی درجے ہیں ایسا نہیں کہ سب کمزور حد تک اکتفا کریں بلکہ ہر کسی کے لیے جس قدر مقدور ہے وہ اسی قدر مکلف ہے، تکلیفِ وجوبی کے اعتبار سے یا تکلیفِ استحبابی کے عنوان سے۔

عمل کی تکمیل

عمل کے لحاظ سے بھی انسان کو اللہ کی ایسے عبادت کرنی چاہیئے جیسے عبادت کا حق ہے اس صورت میں اس کا دل حبِ خدا سے "مُتَیَّم" ہو جائے گا، یعنی محبت سے لبریز ہو جائے گا اور یہ صورت محبوب کے حضور محب کے خضوع اور انکساری کا

سبب ہوگی۔ یہ مقام سب کو میسر نہیں کیونکہ سب کو ترغیب دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس مرتبے کا سوال کریں۔ دعائے کمیل میں ہے:

"واجعل قلبی بحبّك متیّماً"

(اور میرے دل کو اپنی محبت سے لبریز فرما۔)

یا دعائے ابو حمزہ ثمالی میں آیا ہے:

"اللّٰھم انّی اسئلك ان تملأ قلبی حُبّاً لك"

(بارالٰہا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ میرے دل کو اپنی محبت سے لبریز کر دے۔)

ایسی دعاؤں کا مقصود یہ ہے کہ میرا دل محبتِ حق کے اعتبار سے صمد ہو جائے۔ کیونکہ اگر دل محبت میں صمد ہو تو معرفت میں بھی مظہرِ صمد ہوگا اور اخلاص میں بھی۔ اس لیے کہ یہ دعا مانگنے کا حکم سب کو دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت کا راستہ سب کے لیے کھلا ہے۔ نتیجتاً مظہرِ صمد ہونا انسان کے ان بلند مقامات میں سے ہے جن تک سیر و سلوک کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ قرآن کی آیتِ مبارکہ میں اس مقام کے حصول کی علامت بھی بیان کی گئی ہے۔

مندرجہ ذیل آیت کے مفہوم کی بہت ساری آیات ہیں۔

"ألا انّ اولیاء اللّٰہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون"[1]

یعنی اولیاءِ الٰہی ہراساں ہوتے ہیں نہ غمگین۔ حزن و ملال تو جب ہے کہ انسان محبوب کو کھو دے اور اس کے فراق میں غمگین ہو جائے، جب کہ خوف و ہراس اس صورت میں ہوتا ہے جب کوئی جانے کہ آئندہ وہ یقیناً یا احتمالاً اپنے محبوب کو کھو دے گا۔ اگر کسی کا دل حُبِّ خدا سے "متیّم" ہو تو چونکہ ایسے شخص کا محبوب نہ گذشتہ میں اس سے کھویا ہے اور نہ آئندہ کھوئے گا۔ لہٰذا اس کی پاک ذات کے لئے نہ کوئی حزن ہے نہ کوئی خوف۔

---

[1] یونس۔ ۶۲

دینِ الٰہی، مظہرِ صمد

قرآنِ کریم کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دینِ الٰہی جسے خدائے صمد نے بنایا ہے خود مظہرِ صمد ہے لہٰذا تام بھی ہے اور کامل بھی اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس دین کو اختیار کر کے اس کی تعلیمات و احکامات کی برکت سے انسان خدائے صمد کا مظہر ہو جائے۔

مندرجہ ذیل آیات اس سلسلے میں قابلِ توجہ ہیں۔ روزے کے بارے میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"ثم اتموا الصیام الی اللیل"

(پھر روزے کو رات تک تمام کرو۔) (البقرہ - ۱۸۷)

حج کے بارے میں فرماتا ہے:

"واتموا الحج والعمرۃ للہ"

(حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے تمام کرو۔) (البقرہ - ۱۹۶)

اس سے قطع نظر اصل دین کے لیے بھی تمام و کمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی"

(آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی۔) (مائدہ - ۳)

یہ آیۂ شریفہ اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ایک حوالے سے دینِ اسلام جامع دین ہے اور جو کچھ اس میں ہونا چاہیئے تھا وہ اس کا حامل ہے لہٰذا تام ہے اور اس کے اندر کوئی عیب نہیں۔ دوسرے حوالے سے ثمر بخش بھی ہے اور اس کے خارج میں کوئی نقص نہیں ہے لہٰذا وہ کامل ہے۔ نتیجتاً ایک متدین اور دین دار انسان تام بھی ہے اور کامل بھی، کیونکہ اس صورت میں حقیقتِ علم بھی روحِ عالم سے متحد

ہے اور حقیقتِ عمل بھی جانِ عامل سے۔ اس لحاظ سے وہ مظہرِ "صمد" اور مظہرِ "ولی" ہوگا۔

اللہ کے علم و قدرت کا صمدیت و ولایت سے تعلق

جیسا کہ کہا جا چکا ہے اللہ کی ولایت کا سرچشمہ اس کی صمدیت ہے۔ اس امر پر قرآنی استدلال یوں ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے بے کراں علم و قدرت کو اپنی ولایتِ منحصرہ کی علت شمار کرتا ہے۔ سورۂ مبارکہ شوریٰ میں فرماتا ہے:

"فاللہ ھو الولی" (شوریٰ - ۹)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ولایت اس کی ذاتِ اقدس میں منحصر ہے۔ پھر اس امر پر استدلال کے طور پر فرماتا ہے:

"وھو یحی الموتیٰ وھو علیٰ کل شیٔ قدیر" (شوریٰ - ۹)

(یعنی) کیونکہ وہ قدرتِ مطلقہ کا مالک ہے ولایت و سرپرستی اس میں منحصر ہے جب کہ سرپرستی اور امر اجرائی کے لیے فقط قدرت کافی نہیں بلکہ علم بھی درکار ہے لہٰذا فرماتا ہے:

"لہ مقالید السمٰوٰت والارض یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انہ بکل شیٔ علیم" (شوریٰ - ۱۲)

یعنی آسمانوں اور زمین کا قلادہ دستِ خدا میں ہے۔ "قلادہ" سے مراد کپڑے یا کسی اور کی بنی ہوئی کوئی چیز جسے گردن میں ڈالا جاتا ہے[1]۔ زمین و آسمان چونکہ خدا کے حضور گردن جھکائے ہوئے ہیں لہٰذا فرماتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی گردن پر محیط قلادہ دستِ خدا میں ہے کیونکہ وہ ہر چیز کا عالم ہے وہ جانتا ہے کہ بسط و کشایش کا مقام کونسا ہے اور قبض و گرفت کی جگہ کونسی ہے۔ کہاں زندہ کرنا ہے اور کہاں مارنا ہے جب یوں ہے تو "یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر" یعنی روزی کی وسعت و تنگی اس

---

[1] جیسے گلوبند، طوق اور پٹا وغیرہ۔ (مترجم)

کے ہاتھ میں ہے خواہ ظاہری روزی ہو جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور خواہ باطنی روزی ہو کہ جس کی بڑی اہمیت ہے مثلاً علم اور کمالاتِ نفس۔

حضرت شعیب سلام اللہ علیہ جب اپنی نبوت کا ذکر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں:

" رزقنی منہ رزقاً حسناً "

(اللہ نے مجھے بہت اچھا رزق عطا کیا ہے) (ہود - ۸۸)

اللہ تعالےٰ بھی نبوت اور معارفِ الٰہی کا ذکر کرتا ہے تو فرماتا ہے:

" اھم یقسمون رحمت ربک نحن قسمنا بینھم معیشتھم " (زخرف - ۳۲)

یعنی کیا رحمت، نبوت اور معارف کی تقسیم ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ جو جسے دل میں آئے پیغمبر بنادیں؟ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ امر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے:

" انہ بکل شئ علیم "

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی ولایت کے اثبات کے لئے علم و قدرت کی دو حدِ وسط کے ذریعے استدلال کیا گیا ہے، اس طرح سے کہ وہ قدیر ہے اور ہر قدیر ولی ہے لہٰذا وہ ولی ہے نیز وہ علیم ہے اور ہر علیم ولی ہے، پس وہ ولی ہے جو ذاتِ بیکراں علم و قدرت سے بہرہ ور ہے یعنی عیب و نقص سے مبرا ہے صمد ہے اور اگر انسان مظہرِ ولی بننا چاہے کہ جو اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور دنیا میں کوئی کام کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ وہ مظہرِ علیم و قدیر ہو اور نتیجتاً مظہرِ صمد ہو۔

ولایت میں علم و عمل کا کردار

ایک نکتہ جس سے غفلت نہیں کی جانا چاہیئے یہ ہے کہ ولایتِ الٰہی کے مقامِ مظہریت کا حصول جیسے علم و عمل پر منحصر ہے اس کی بقا بھی انہی دو سے وابستہ ہے۔ اس امر کا راز یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سوءِ علم و عمل کے نتیجے میں ولایتِ الٰہی کے ماتحت نہ ہو تو وہ ولایتِ شیطان کے ماتحت قرار پائے گا۔ کیونکہ عمل و جزا کی عینیت کی بنا پر کبھی

گناہ آئینۂ دل کے لیے غبار بن جاتا ہے :

"کلا بل رأن علی قلوبھم ما کانوا یکسبون" [۱]

(سچ تو یہ ہے کہ ان کے قلوب ان اعمال (بد) کے سبب زنگ آلود ہیں جو انہوں نے کمائے)۔

کبھی انسان پر ولایتِ شیطان کی صورت میں ظہور کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ انعام کی آیت ۱۲۵ میں فرمایا گیا ہے :

"فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ۝ ومن یرد ان یضلّہ یجعل صدرہ ضیّقاً حرجاً کانّما یصّعّد فی السماء"

(اللہ جس شخص کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینے کو تنگ اور دشوار گزار بنا دیتا ہے گویا قبولِ ایمان اس کے لیے آسمان پر چڑھ گیا ہے۔)

اللہ تعالےٰ نے ارادۂ تشریعی کے ذریعے سب انسانوں کو ہدایت فرمائی ہے۔ "لھدی النّاس" [۲] یا "للعالمین نذیراً" [۳] وغیرہ۔ البتہ بعض خاص افراد کو وہ خصوصی ہدایت سے بہرہ ور کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کا حکم سن کر اس پر عمل درآمد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لہٰذا خصوصی ہدایت سے بہرہ ور ہیں۔ ان کے مقابل ایک ایسا گروہ ہے کہ ہدایتِ الٰہی اس تک پہنچی اور حجت اس پر تمام ہو گئی لیکن اس نے دینِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اللہ تعالےٰ بھی ایسوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے لہٰذا مذکورہ بالا آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے :

"کذٰلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون"

جن کی سیرت ہی عدمِ ایمان ہے، اس طرح سے کہ ان کے سامنے جو بھی دلیل

---

[۱] مطففین۔ ۱۴

[۲] رعد۔ ۳۱ [۳] فرقان۔ ۱

پیش کی جائے اسے قبول نہیں کرتے۔ اللہ رجس و ناپاکی کو ان پر نازل کرتا ہے۔ رجس سے مراد دل کا بند ہو جانا ہے، جو اختیار کے غلط استعمال کے نتیجے میں دامن گیر ہوتا ہے۔ اگر کسی کا دل بند ہو جائے اور نورِ الٰہی اس پر نہ چمکے تو شیطان اس میں اپنا گھر بنا لیتا ہے۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ بعض افراد کے دل میں شیطان آشیانہ بنا لیتا ہے "فَبَاضَ وَفَرَّخَ فِی صُدُوْرِهِمْ" اور پھر وہاں وہ انڈے دیتا ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ اس کے بعد "نَظَرَ بِأَعْيُنِهِمْ وَنَطَقَ بِأَلْسِنَتِهِمْ" شیطان ان کی زبان سے گفتگو کرتا ہے اور ان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں بھی خدا نے فرمایا ہے:

"كذلك يجعل الله الرجس على الذين لا يؤمنون ○ وهٰذا صراط ربك مستقيمًا قد فصلنا الاٰيٰت لقوم يذكرون ○ لهم دار السلام عند ربهم وهو وليهم بما كانوا يعملون ○"

(جو لوگ ایمان نہیں لائے خدا ان پر رجس و ناپاکی کو اسی طرح مسلط کرتا ہے، اور (اے رسول) یہ (اسلام) تمہارے پروردگار کا (بنایا ہوا) سیدھا راستہ ہے۔ عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے ہم نے اپنی آیات تفصیلاً بیان کر دی ہیں۔ ان کے لیے ان کے پروردگار کے ہاں امن و چین کا گھر (بہشت ہے) اور دنیا میں جو کچھ انہوں نے کیا ہے ان کے عوض خدا ان کا سرپرست ہے۔)

(انعام - ۱۲۵ تا ۱۲۷)

چونکہ ان کا عمل صحیح و سالم ہے یہ ولایت خدا کے ماتحت ہیں۔ جیسے اگر کسی کا عمل اندر سے معیوب ہو اور باہر سے ناقص ہو تو وہ ولایت شیطان کے ماتحت ہو گا۔ اس حقیقت کی طرف بعد کی آیات یوں متوجہ کرتی ہیں:

"ويوم يحشرهم جميعًا يا معشر الجن قد استكثرتم من

الانس وقال اولیاءھم من الانس ربنا استمتع بعضنا ببعض وبلغنا اجلنا الذی اجلت لنا، قال النار مثوٰکم خالدین فیھا الا ماشاء اللہ ان ربک حکیم علیم، وکذلک نولی بعض الظالمین بعضًا بما کانوا یکسبون "[1]

یعنی قیامت کے دن اللہ جنوں اور ایسے شیاطین کہ جو جنوں سے ہیں، سے فرمائے گا کہ تم بہت سے افراد کو اپنی طرف لے گئے ان کے اولیاء انس یہ کہیں گے کہ ہم نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے لیکن اللہ تعالےٰ فرمائے گا کہ ان فوائد کی حقیقت یہ تھی کہ ہم نے ان کاموں کے بدلے جن کا ارتکاب انہوں نے کیا تھا ایک ظالم کو دوسرے ظالم کا سرپرست قرار دیا۔

نتیجہ یہ کہ چاہے ولایتِ الٰہی ہو یا ولایتِ شیطان دونوں میں عمل کا بہت ہاتھ ہے۔ عمل کے اس مطلق مفہوم میں علم بھی شامل ہے۔ البتہ عمل مقید جو علم کے مقابل ہے، علم اس میں شامل نہ ہوگا۔

والحمد للہ رب العالمین

---

[1] انعام - ۲۸ ، ۲۹

درس ۱۲

ہماری بحث اس بارے میں تھی کہ اگر انسان چاہتا ہے کہ وہ ولایت کے بلند و بالا مقام پر فائز ہو اور مظہر اسم "ولی" بن جائے کہ جو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے تو ضروری ہے کہ وہ پہلے مظہر اسم "صمد" بنے۔ اور چونکہ حقیقتِ انسان ایک فکر کرنے والے موجود ہونے کے لحاظ سے علم و عمل سے عبارت ہے لہٰذا مظہرِ صمد ہونے کے لیئے ضروری ہے کہ وہ علمی پہلو سے بھی مظہرِ صمد ہو اور عملی لحاظ سے بھی۔

علمی اعتبار سے انسان اس وقت مظہرِ صمد بنتا ہے جب اس کے افکار و ہم و خیال سے محفوظ ہوں اور اس کے افکار اور استدلال یقینیات پر مشتمل ہوں۔ عملی پہلو سے وہ اس وقت مظہرِ صمد ہوگا کہ اس کی نیت اور ارادے پر اخلاص کے علاوہ کسی چیز کی حکومت نہ ہو کیونکہ شیطان اگر انسان پر مسلط ہونا چاہے تو وہ افکار کے ذریعے داخل ہوتا ہے یا پھر ارادے اور نیت کے راستے سے۔

اصالتِ معرفت

اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ فکر و معرفت عقلِ نظری کی صفات میں سے ہیں جب کہ نیت اور ارادہ عقلِ عملی کا حصہ ہیں اور یہ ایک دوسرے کے بالمقابل نہیں ہیں۔ معرفت ہرگز ارادہ و نیت کی ہمسر نہیں ہو سکتی بلکہ عقلِ عملی کا سرچشمہ عقلِ نظری ہے۔ اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے پر متقابلاً اثر انداز ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتی ہیں لیکن معرفت و شناخت جڑ ہے اور نیت و ارادہ اس کی شاخ ہے۔ اس لحاظ سے ابتداء میں شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ انسان کی فکری بنیادوں میں رخنہ اندازی کرے۔ اس طرح عمل پر اس کے نفوذ و تسلط کی راہ خود بخود ہموار ہو جاتی ہے لہٰذا شیطان کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی ادراکی اور تحریکی قوتوں کو ولایتِ خدا کے ماتحت قرار دے اور اپنے حریمِ دل کو ہمیشہ شیطان کی دستبرد اور تصرف سے محفوظ رکھے وگرنہ اس کی ادراک و تحریک کی قوتوں کی سرپرستی اس کے بجائے شیطان اپنے

ذمہ لے لے گا اور امیر المؤمنین علیہ السلام کے الفاظ میں اس کی عقل ہوائے نفس کے زندان میں اسیر ہو جائے گی۔ آپؑ فرماتے ہیں "کم من عقل اسیر عند ھوی امیر"[1] یعنی کتنی ہی عقلیں جہادِ اکبر میں شکست کھا گئیں اور ہوا و ہوس کی اسیر ہو گئیں۔

ادراک پر کنٹرول کے ذریعے جذبات پر تسلّط

یہاں ایک نکتہ جو قابلِ اہمیت ہے یہ ہے کہ اگرچہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ادراک و جذبات پر مسلط ہو تاکہ رفتہ رفتہ وہ مظہرِ "ولی" بن جائے لیکن ادراک کی قوتوں اور صلاحیتوں کی سرپرستی اور انھیں وہم و خیال کے تصرف سے محفوظ رکھنا ہی درحقیقت تحریک و جذبات کی قوتوں کو کنٹرول کرنے اور انہیں شہوت و غضب کے نقصان سے بچانے کی اساس ہے۔ اس سلسلے میں ہم کتاب "غرر الحکم و درر الکلم" سے امیر المؤمنین علیہ السلام سے چند روایات نقل کرتے ہیں تاکہ یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے فرمودات

امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَصْلُ الْعَزْمِ الْحَزْمُ وَ ثَمَرَتُهُ الظَّفَرُ"[2]

جس طرح کہ پہلے بیان کیا گیا ہے راہِ ولایت میں وہ دو رکن کہ جو فریضے کی حیثیت رکھتے ہیں، معرفت و اخلاص سے عبارت ہیں جبکہ دیگر امور نافلہ شمار ہوتے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ہمسر نہیں ہیں کیونکہ اخلاص عقلِ عملی کے ذمہ

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر ۲۰۲

[2] غرر الحکم، ج ۲، نمبر ۳۰۹۵،

ہے اور معرفت عقلِ نظری کے حصے میں آتی ہے جو اساس و بنیاد ہے۔ لہٰذا آپؑ نے فرمایا: "اَصْلُ الْعَزْمِ الْحَزْمُ" عزم کی بنیاد دور اندیشی اور فراست ہے۔ عزم و ارادہ عقلِ عملی کا کام ہے جبکہ فراست و دور اندیشی عقلِ نظری کے حصے میں ہے اس لحاظ سے وہ شخص اہلِ عزم و ارادہ ہے جو اچھی طرح سمجھے۔ دوسرے لفظوں میں عزم کہ جو عقلِ عملی کا کام ہے اس دور اندیشی کا مرہونِ منت ہے جو عقلِ نظری کا کام ہے۔ لہٰذا وہ عزم جو دور اندیشی کے ساتھ ہو اس کا نتیجہ کامیابی و کامرانی ہے، چاہے جہادِ داخلی ہو اور چاہے جہادِ خارجی۔

آپؑ کا یہ بھی فرمان ہے:

"افضل القلوب قلب حشی بالفہم"[1]

روئی یا پرندوں کے پروں سے بھرے ہوئے تکیے کو عربی میں "وِسادۃٌ محتشیۃٌ" کہتے ہیں نیز زیادہ دانوں پر مشتمل انار کو "اِحْتَشَتِ الرُّمَّانَۃُ بِالْحَبِّ" کہتے ہیں یعنی انار دانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس بنا پر حدیث شریف کا معنی یہ ہے کہ دلوں میں سے بہترین دل وہ ہے جو فکر سے لبریز ہو جس طرح بدترین پیٹ بھرا ہوا پیٹ ہے (کیونکہ پُرخوری ادراک کی سب سے بڑی رکاوٹ شمار ہوتی ہے) اسی طرح بہترین دل وہ ہے جو فہم و فراست سے پُر ہو۔

جو بہت سے مسائل کو نہیں جانتا وہ اَجْوَفُ ہے (یعنی خالی ہے) نہ کہ صمد۔ لہٰذا ایسا شخص اہلِ عزم و ارادہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ فتح مند اور کامیاب بھی نہ ہوگا۔ نتیجتاً ایسے افراد کے افکار پراگندگی کا شکار ہوتے ہیں اور قرآنِ کریم کے الفاظ میں "فھم فی امر مریج"[2] یعنی بعض پراگندگی کا شکار ہیں کیونکہ انسان اپنے آپ کا مولا و مالک نہ بنے اور اپنے دل کی بنجر زمین کو خود آباد نہ کرے تو شیطان اس میں

---

[1] غرر الحکم ج ۲ نمبر ۳۰۷۸

[2] ق - ۵

بیج بوتا ہے اور یوں انسان کا حریم دل تاریک ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا امیر المؤمنین علیہ السلام علمی خلا کو پُر کرنے کے لیے سب کو ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

"اعلم الناس المستهتر بالعلم"[1]

یعنی سب سے زیادہ عقلمند وہ لوگ ہیں جو انتہائی شوق و ذوق سے تحصیلِ علم کی کوشش کرتے ہیں اور سعی کرتے ہیں کہ ان خالی ظروف کو بھر لیں۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

"اصل صلاح القلب اشتغاله بذكر الله"[2]

اگرچہ بہت سے عوامل تہذیب و تزکیۂ نفس میں حصہ دار ہیں لیکن اصلاحِ دل کی اساس یادِ حق میں مشغول رہنا ہے۔ البتہ یہ بات واضح و روشن ہے کہ پہلے معرفتِ حق ذکرِ حق کیلئے زمینہ ہموار کرتی ہے اور اس کے بعد ذکرِ حق اصلاحِ دل کا موجب بنتا ہے اور جس طرح معرفتِ نفس تمام کمالات کی جڑ ہے اسی طرح اس کی عدمِ شناخت تمام مفاسد کا باعث ہوگی۔ اس جہت سے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"اعظم الجهل جهل الانسان امر نفسه"[3]

یعنی سب سے بڑی جہالت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہ پہچانے۔ کیونکہ اگر اپنے آپکو ایک جاہدی حقیقت ہے، نہیں پہچانے گا تو اُسے سستے داموں بیچ ڈالے گا۔ اسی ضمن میں آپؑ مزید فرماتے ہیں :

"اعظم مُلكٍ مُلكُ النفس"[4]

یعنی بالاترین تسلط نفس پر تسلط ہے جو جہادِ اکبر میں مجاہد کو نصیب ہوتا ہے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

"اقوى الناس من قوى على نفسه"[5]

یعنی طاقت ور ترین لوگ وہ ہیں جو اپنے نفس پر تسلط رکھتے ہوں۔ ایک طرف

---

[1] غرر الحکم ج ۲ نمبر ۳۰۷۹ [2] غرر الحکم ج ۲ - نمبر ۳۰۸۳ - [3] غرر الحکم ج ۲ نمبر ۲۹۳۶
[4] غرر الحکم ، ج ۲ - نمبر ۲۹۶۶ [5] غرر الحکم ج ۲ نمبر ۳۰۷۳

استدلال کے ذریعے حس، خیال اور وہم کو عقلِ نظری کے کنٹرول میں لے آئیں اور دوسری طرف عمل میدان میں اپنی شہوت اور غضب پر قابو پاتے ہوئے انہیں عقلِ عملی کے ماتحت قرار دیں جو شخص عقلی دلائل و براہین میں بھی مثال کا خواہاں ہو وہ ابھی تک مرحلۂ حس میں ہی سرگرداں ہے کیونکہ جو شخص اس مرحلے سے گزر جائے وہ کبھی مثال کی فکر نہیں کرتا بلکہ وہ برہان کے حدِ وسط کی فکر میں ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ تیر و مند اور سب سے طاقتور انسان وہ ہے جو اپنی علمی اور عملی قوتوں پر غالب آجائے۔

"اعقل الناس ابعدھم عن کلّ دنیّۃ"[1]

عقلمند ترین انسان وہ ہے جو ہر پستی و ذلت سے سب سے زیادہ دور ہو۔

اس لحاظ سے سب سے زیادہ عقلمند انسان وہ ہے جو علمی مسائل میں حسّ خیال اور وہم سے پرہیز کرے اور عملی مسائل میں شہوت اور غضب سے اجتناب کرے۔

"اکبر البلاء فقر النفس"[2]

یعنی بدترین بلا فقرِ روح ہے اور فقرِ روح یہ ہے کہ وہ علم و اخلاص سے عاری ہو۔

"اقرب الآراء من النّھی ابعدھا من الھوی"[3]

یعنی بہترین اور عقل سے قریب ترین رائے وہ ہے جو ہوا و ہوس سے دور تر ہو۔ عقل کو اس لیے "نُھیَۃ" کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کو ہر پستی و ذلت سے نہی کرتی ہے۔ اس کی جمع "نُھیٰ" ہے جو قرآنِ کریم میں بھی آئی ہے:

"انّ فی ذٰلک لآیات لأولی النُّھیٰ"[4]

آپ ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں:

"اقبح الصّدق ثناء الرّجل علیٰ نفسہ"[5]

۱۔ غرر الحکم ج ۲ - نمبر ۳۰۷۳
۲۔ غرر الحکم ج ۲ - نمبر ۲۹۶۵
۳۔ غرر الحکم ج ۲ - نمبر ۳۰۲۲
۴۔ طٰہٰ ـ ۱۲۸
۵۔ غرر الحکم ج ۲ نمبر ۲۹۴۲

قبیح ترین سچ وہ ہے جو انسان اپنی تعریف و تمجید میں بولتا ہے۔ اگر کسی میں کمال نہ ہو اور پھر بھی وہ اپنے آپ کو اس کمال سے متصف ظاہر کرے تو اس نے جھوٹ کہا ہے لیکن اگر وہ صاحبِ کمال ہو اور اس کمال کی وجہ سے اپنی تعریف و تمجید کرے تو وہ بدترین سچ زبان پر لایا ہے کیونکہ اپنی ستائش و تعریف کے دوران میں نفس دوسرے مواقع کی نسبت زیادہ غرور اور خود خواہی کے جال میں پھنستا ہے۔ لہٰذا عہد نامۂ مالک اشتر میں یوں ہے: "اے مالک! جب تیری مدح و ستائش کی جائے تو اس وقت شیطان کے حملے کے لیے بہترین اور مناسب موقع ہوتا ہے۔ لہٰذا اس وقت تو اپنی طرف پوری طرح متوجہ رہ۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک اور فرمان بھی ہے جو اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ عقلِ عملی کے بجائے عقلِ نظری کو اصالت اور فوقیت حاصل ہے۔ وہ فرمان یہ ہے:

"اَلزُّھد ثمرۃُ الیقین"[1]

زُہد ادراکِ یقینی کا نتیجہ ہے۔ زہد عقلِ عملی کا کام ہے کیونکہ عقلِ عملی ہی وہ طاقت ہے کہ جذبات کو اعتدال پر رکھنا جس کے ذمہ ہے۔ اگرچہ بعض نے عقلِ عملی کو حکمِ عملی کی شناخت کا ذریعہ سمجھا ہے لیکن اگر عقلِ عملی کو نفس کے لیئے مدبرِ عمل قرار دیں تو اس سے منطقی ترتیب بھی ملحوظ رہے گی اور بات روایات سے ہم آہنگ بھی ہو جائے گی۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"اَلعَقلُ مَا عُبِدَ بِہِ الرَّحمٰنُ وَ اکتُسِبَ بِہِ الجِنَانُ"[2]

عقل ایسی چیز ہے جس کے ذریعے رحمٰن کی عبادت کی جائے اور یہ بہشت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ایک اور جگہ پر امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لا عقل کالتدبیر"[3]

---

[1] غرر الحکم، ج ۱، نمبر ۴۵۸

[2] اصولِ کافی کتاب عقل و جہل حدیث نمبر ۳

[3] غرر الحکم ج ۶، نمبر ۱۰۴۴۵

واضح سی بات ہے کہ عبادت، کسبِ بہشت اور تدبیر کا شمار اعمال میں ہوتا ہے اور عقلِ عملی سے ان اعمال کی بجا آوری قوتِ ادراک کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ عزم و ارادہ ہے جو ان کاموں اور دوسرے افعال کی بجا آوری کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا فیصلہ کرنے والی قوت عقلِ عملی ہے نہ کہ قوتِ ادراک۔

مذکورہ نکتے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زہد عقلِ عملی کا کام ہے اور یقین عقلِ نظری کا اور عقلِ عملی عقلِ نظری ہی کا نتیجہ و ثمر ہے۔ البتہ زہد چونکہ ایک مشکل کام ہے لہٰذا ابتدا میں زحمت و مشقت سے زہد کو اختیار کیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ یہ ملکہ بن جائے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی تعبیر کے مطابق:

"اوّل الزھد التزھّد"[1]

یعنی تکلف و زحمت سے زہد کو قبول کرنے اور پھر اس کی مشق کرنے سے زاہد ہونے کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔ "تزھّد" اس زہدِ حقیقی کو کہتے ہیں جس میں زحمت و مشقت اٹھانا پڑے اور یہ "تزھّد" سے مختلف ہے جو زہد کا تظاہر اور دکھلاوا کرنے کا نام ہے کیونکہ "تزہد" کا نتیجہ زہد ہے۔

"التزھّد یؤدّی الی الزھد"[2]

(تزہد زہد تک پہنچاتا ہے)

جب کہ "تزہد" منافقت اور ہلاکت پر منتہی ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام حقیقتِ زہد کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

"الزھد تقصیر الآمال و اخلاص الأعمال"[3]

یعنی زہد خواہشوں اور آرزوؤں کو کم کرنے اور اعمال کو غیر خدا کے شائبے سے خالص و پاک کرنے کا نام ہے۔ ایک جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

۱۔ غرر الحکم، ج ۲، نمبر ۲۹۲۲
۲۔ غرر الحکم ج ۲، نمبر ۱۸۴۴
۳۔ غرر الحکم ج ۱، نمبر ۱۱۳۰

"ان عقلتَ امرکَ واصبتَ معرفةَ نفسکَ فاعرض عن الدنیا وازهدْ فیھا" [1]

یعنی اگر تو نے اپنے آپ کو پہچان لیا اور اپنے نفس کی معرفت حاصل کر لی تو دنیا سے منہ پھیر لینا اور زاہد ہو جانا۔ یہاں زہد کو معرفت پر منحصر قرار دینے سے یہ بات پتا چلتی ہے کہ اگر زہد معرفت کی بنیاد پر ہو تو پائدار ہوتا ہے ورنہ کسی اور صورت میں اس کی تاثیر یا بقا کی کوئی امید نہیں۔

اس امر کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اگرچہ عقل عملی عقل نظری کے بغیر ممکن نہیں اور وہ ہمیشہ عقل نظری سے ہی مدد لیتی ہے لیکن جس طرح ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے یہ اسے اور نکھارتی ہے۔ اس ضمن میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بالزھد تثمر الحکمة" [2]

یعنی معرفت زہد کے ساتھ ثمر آور ہوتی ہے۔ اصولی طور پر یقین کے پہنچنے کی بہترین راہ عبادتِ حق تعالے ہے۔ اس طرح کی عبادتیں علم کو ملکہ میں تبدیل کر دیتی ہیں اور دوسری طرف معرفت جب تک جامۂ عمل نہ پہن لے اس وقت تک ایک دنیاوی پیشہ ہے۔ لیکن جب عملی صورت اختیار کر لے کھل اٹھتی ہے اور ثمر آور ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ فرماتے ہیں کہ اگر عارف ہو جاؤ تو زہد اختیار کرنا تاکہ وہ حکمت ثمر بخش ہو اور اگر چاہتے ہو کہ حکمت کو ثمر کرو تو عبادت و سجود بجا لاؤ۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے الفاظ میں سجدے کی دو قسمیں ہیں۔ سجدۂ بدنی اور سجدۂ نفسانی۔ سجدۂ بدنی معروف سجدہ ہی ہے جس میں پیشانی، دو ہاتھ، دو زانو اور دونوں پاؤں کے انگوٹھوں کو زمین پر لگایا جاتا ہے جبکہ سجدۂ نفسانی کچھ اس طرح سے ہے:

"السجود النفسانی فراغ القلب من الفانیات والاقبال

---

[1] غرر الحکم، ج ۳، نمبر ۳۷۳۳ [2] غرر الحکم ج ۳، نمبر ۴۲۲۹

بکنه الهمة علی الباقیات"[۱]

یعنی سب سے پہلے جو کچھ بھی فانی اور ناپائیدار ہے اسے دل سے باہر نکالے تاکہ دل خالی ہو جائے اور پھر جو کچھ باقی اور ابدی ہے اسے دل میں جگہ دے اور انہی سے اپنے دل کو بھر لے تاکہ تخلیہ کے بعد تحلیہ وقوع پذیر ہو، یعنی اس کے صاف پاک ہونے کے بعد وہ مزین ہو جائے۔ اس کے بعد آپؑ نے اس کے کچھ نمونے بھی ذکر فرمائے:

"وَخَلْعُ الْكِبْرِ وَالْحَمِيَّةِ وَقَطْعُ الْعَلَائِقِ الدُّنْيَوِيَّةِ وَالتَّحَلّی بِالْخَلَائِقِ النَّبَوِيَّةِ"[۲]

یعنی غرور، تکبر، تعصب اور دنیاوی وابستگیوں سے جدا ہونا اور اپنے آپ کو اخلاقِ انبیاء سے مزین کرنا ہی سجدۂ نفسانی ہے۔ مختصر یہ کہ یقین و معرفت کے پہنچنے کے لیے اہم ترین عامل عبادات ہی ہیں۔

اوّل الحکمة ترك اللذات وآخرها مقتُ الفانیات"[۳]

اوّلِ حکمت لذتوں کا ترک کرنا ہے۔ سیر و سلوک کی ابتداء میں انسان لذتوں کو ترک تو کر دیتا ہے لیکن ان سے متنفر نہیں ہو پاتا۔ آہستہ آہستہ وہ ان لذتوں کی اندرونی اور ملکوتی صورت کو پہچاننے لگتا ہے اور پھر اس مرحلے کے بعد یعنی جب اس کا علم حصولی شہود کی منزل تک پہنچ جائے اور وہ دنیا اور اس کی زود گزر لذتوں کے قبیح و کریہہ چہرے کو دیکھنے لگے تو پھر غصے کی حالت میں ان سے بھاگنے لگتا ہے ممکن ہے کہ کوئی جاہ و مقام سے دور رہے لیکن ہر کوئی یہ نہیں کر سکتا کہ اسے بھیڑ کی چھینک سے کمتر سمجھے یہ امیر المؤمنین علیہ السلام جیسے بلند مرتبہ عارف کا کلام ہے کہ جو آخرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ جو درحقیقت دنیا ہی کا باطن ہے۔ اس لحاظ سے

---

۱ غرر الحکم - ج ۲ - نمبر ۲۲۱۰، ۲۲۱۱ ۲ غرر الحکم، ج ۲ - نمبر ۲۲۱۰، ۲۲۱۱

۳ غرر الحکم - ج ۲ - نمبر ۳۵۴۲

دنیا نہ صرف اس کی محبوب نہیں ہے بلکہ وہ اس سے متنفر اور بیزار ہے۔

"اصل الاخلاص الیأس مما فی ایدی الناس"[1]

یعنی اخلاص کی بنیاد یہ ہے کہ انسان جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے مایوس اور نا امید ہو، اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے ہمیشہ اس کی امید رکھے۔ اس بات کی تائید میں امیر المؤمنین علیہ السلام اپنے ایک اور نورانی کلام میں غیر خدا سے سوال سے پرہیز اور خدا سے درخواست اور التجا کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"التقرب الی اللہ تعالیٰ بمسألتہ والی الناس بترکہا"[2]

یعنی اگر کوئی معاشرے میں ہر دلعزیز اور لوگوں کا مقرب بننا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ ان سے کوئی چیز نہ مانگے لیکن اگر خدا کے نزدیک ہونا چاہتا ہے تو جو کچھ خدا کے ہاں ہے اس کا سوال کرے۔ خدا سے سوال کرنا اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس کی درخواست کرنا انسان کو خدا کے قریب کرتا ہے۔

"اعلم الناس باللہ اکثرھم لہ مسألۃ"[3]

جو خدا کو بہتر اور زیادہ پہچانتا ہے وہ خدا سے زیادہ طلب کرتا ہے۔ سوال کہ جو دعا ہی ہے ایک طرح کی عبادت ہے، یہ جملہ بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ عقل عملی کا دائرۂ کار معرفت سے مربوط ہے کہ جو عقل نظری کا کام ہے لہٰذا جس طرح ہم پہلے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ معرفت اصل اور جڑ ہے جبکہ اخلاص اور عقل عملی کے دوسرے پہلو اس کی شاخیں ہیں۔

"سلوا اللہ العفو والعافیۃ وحسن التوفیق"[4]

"من سأل اللہ اعطاہ"[5]

"لیکن مسألتک مایبقی لک جمالہ ویُنفی عنک وبالہ"[6]

---

[1] غرر الحکم، ج ۲، نمبر ۳۰۸۸ [2] غرر الحکم ج ۲ نمبر ۱۸۰۱ [3] غرر الحکم، ج ۲، نمبر ۳۳۶۰
[4] غرر الحکم، ج ۴، نمبر ۵۵۹۴ [5] غرر الحکم ج ۵ نمبر ۸۰۷۳ [6] غرر الحکم، ج ۵، نمبر ۷۳۷۹۔

«ما من شیء احب الی الله سبحانه من ان یسأل»۔ [1]

«نسأل الله سبحانه تعالیٰ لمنته تماما و بحبله اعتصاما»۔ [2]

«نسأل الله سبحانه منازل الشهداء و معایشة السعداء و مرافقة الانبیاء»۔ [3]

یہ سب کلمات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ معرفت حق تعالےٰ انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ اللہ تعالےٰ سے جو کچھ اس کے پاس ہے اسے طلب کرے۔ شہید کا مقام و مرتبہ، انبیاء سے دوستی و رفاقت اور سعادتمند لوگوں کے ساتھ زندگی اور اچھی عاقبت حضرت علی علیہ السلام کی ان اہم دعاؤں میں سے ہیں کہ جو آپ کے کلام میں نظر آتی ہیں۔

مختصر یہ کہ اگر کوئی معرفت میں بھی اور عمل و اخلاص میں بھی صمد ہو جائے تو وہ خود اپنا مولا بن جائے گا نتیجتاً اس دائرۂ ولایت میں شیطان داخل نہیں ہو سکتا اور جو جگہ شیطان کے تصرفات سے محفوظ ہو وہ رحمان کا محلِ ظہور ہو گی اور جب رحمان ظہور کرے گا تو اس وقت ایسا شخص "ولی" کے بلند و بالا اسم کا مظہر بن جائے گا اور پھر وہ مسائلِ تکوینی میں بھی اور مسائلِ تشریعی میں بھی ایسے کام انجام دے گا کہ جو کارِ خدا کا مظہر ہوں گے۔

الحمد للہ رب العالمین

---

[1] غرر الحکم ج ۵ نمبر ۹۴۷۳، [2] غرر الحکم، ج ۶، نمبر ۹۹۴۹ [3] غرر الحکم ج ۶، نمبر ۱۰۰۰۷

درس ۱۳

عبادت و ولایت

ولایت کو ثابت کرنے والی راہوں کے بارے میں ہماری بحث یہاں تک پہنچی تھی کہ اگر کوئی ولی اللہ بننا چاہے تو اس کی راہ عبادتِ خدا ہے کیونکہ انسان عبادت و بندگی کے ذریعے ہی محبوب خدا ہوتا ہے البتہ عبادت و بندگی اپنے وسیع مفہوم میں کہ جس میں تمام احکامِ الٰہی کی اطاعت شامل ہے اور محبوبِ خدا ہی ولایتِ الٰہی کے مقام تک پہنچتا ہے۔

قربِ نوافل کی حدیث

اہلِ بیت علیہم السلام کی احادیث کہ جن کا مرتبہ قرآنِ حکیم کے بعد ہے میں بھی یہ بات موجود ہے ہم چند روایات کا ذکر کرتے ہیں کہ جو مذکورہ آیات کی تائید کرتی ہیں اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ مقامِ ولایت کا حصول فقط احکامِ الٰہی کی ہمہ پہلو اطاعت کے ذریعے ممکن ہے۔

فریقین نے رسول اللہؐ سے ایک روایت اپنی کتبِ احادیث میں نقل کی ہے۔ یہ روایت "حدیثِ قربِ نوافل" کے نام سے مشہور ہے اس کا شمار مشہور اور معتبر احادیث میں ہوتا ہے۔ عربی لٹریچر کی نظم و نثر میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ یہ روایت ابان بن تغلب نے حدیثِ قدسی کے عنوان سے امام محمد باقر علیہ السلام سے یوں نقل کی ہے: "لما اسری بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: یا ربّ ماحال المؤمن عندك؟ قال یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من اھان لی ولیًّا فقد بارزنی بالمحاربۃ وانا اسرع شیء الی نصرۃ اولیائی و ما یتقرب

الیّ عبد من عبادی بشیٔ احبّ الیّ ممّا افترضت علیہ "

یعنی جب معراج کی رات اللہ تعالےٰ نے رسول اللہؐ کو مہمان بلایا تو انہوں نے اللہ سے سوال کیا: "پروردگارا! تیرے نزدیک مومن کی منزلت کیا ہے؟" تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے محمدؐ! جو کوئی میرے کسی ولی کی اہانت کرتا ہے وہ کھلے بندوں میرے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور میں اپنے اولیاء کی نصرت میں ہر چیز سے زیادہ سریع ہوں میرے بندوں میں سے کوئی بھی فرائض کی انجام دہی سے بڑھ کر کسی پسندیدہ وسیلے سے میرا تقرب حاصل نہیں کر سکتا۔" یعنی اللہ تعالےٰ کے تقرب کی بہترین راہ فرائض کی انجام دہی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے تمام واجبات تقربِ الٰہی کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔ یہ جو نماز کے بارے میں آیا ہے کہ "الصّلاۃ قربان کلّ تقیّ"[۱] نمونے کے طور پر ہے اور فقط نماز کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ کے بارے میں بھی یہی تعبیر وارد ہوئی ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ثمّ انّ الزّکاۃ جعلت مع الصّلاۃ قربانًا لاھل الاسلام"[۲]

مختصر یہ کہ ہر وہ عمل جس کی درستی میں قصدِ قربت شرط ہے مثلاً زکوٰۃ، حج اور جہاد وغیرہ اور سالک اسے قصدِ قربت سے ہی بجا لائے تو یہ عمل اس کا "قربان" قرار پائے گا یعنی اسے اللہ کے نزدیک کرے گا۔ البتہ جو تقرب فرائض کی بجا آوری سے حاصل ہوتا ہے وہ اس تقرب سے زیادہ ہے جو نوافل کی انجام دہی سے حاصل ہوتا ہے۔

بعد میں آپؐ نے فرمایا:

"وانّہ لیتقرّب الیّ بالنّافلۃ"

یعنی جس طرح فرائض کی بجا آوری تقرب کا باعث بنتی ہے نوافل کی انجام دہی بھی قربتِ الٰہی کا سبب ہوتی ہے قربت کا ہر وہ عمل جو واجب کی مقدار سے زیادہ ہو نافلہ کہلاتا ہے۔ "نفل" یعنی اضافی مقدار۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی بارگاہ میں اولاد کی دعا کی تھی اُسکے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اسحاقؑ کے علاوہ یعقوبؑ ابراہیمؑ کی درخواست سے زیادہ اور نافلہ کے طور پر اُسے عطا کیا اس نے ہم سے فرزند کی خواہش کی اور ہم نے اسے اس کے بیٹے اسحاقؑ کے علاوہ ایک پوتا بھی بنام یعقوبؑ بخش دیا۔

"ووھبنا لہ اسحٰق و یعقوب نافلۃً وکلًّا جعلنا صالحین"[1]

اس حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ عبد سالک نافلہ کے وسیلے سے ہی میرے نزدیک ہوتا ہے "حتّٰی اُحبّہٗ" یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل و مستحبات کو بجالانے والے سب لوگ محبوبِ حق تعالےٰ نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ ہی اس سیرِ نوافل کو جاری رکھتا ہے یہاں تک کہ محبوبیتِ خدا کے بلند مقام تک پہنچتا ہے۔ ان تھوڑے سے افراد کی خصوصیت یہ ہے کہ اولاً وہ نوافل کو محبتِ خدا میں بجالاتے ہیں نہ کہ جنت کے شوق میں یا جہنم کے خوف سے، اپنی برائیوں کو محو کرنے کے لیے یا پھر فرائض میں نقص کی تلافی کے لئے۔ جس طرح کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ نافلہ کی انجام دہی اور اسی طرح نماز کے بعد سجدۂ شکر کی بجاآوری فریضہ نماز میں حضورِ قلب نہ ہونے کی تلافی کرتے ہیں۔ ثانیاً وادیِ محبت میں وہ اس سفر کو جاری رکھتے ہیں یہاں تک کہ وہ محبِ خدا سے محبوبِ خدا کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

جی ہاں! بہت سے سالکین محبِ خدا تو ہیں لیکن اس کے محبوب نہیں ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا ہے کہ لوگوں سے کہو کہ اگر آپ اللہ کے دوست ہیں تو حبیبِ خدا کی پیروی کریں یہاں تک کہ خود محبوبِ خدا بن جائیں۔

"ان کنتم تحبّون اللہ فاتّبعونی یحببکم اللہ"[2]

حاشیہ صفحہ سابقہ [1] من لا یحضرہ الفقیہ ج ۱ نمبر ۶۳۷ [2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۹۰

حاشیہ صفحہ ہذا [1] انبیاء - ۷۲ [2] آل عمران - ۳۱

حبیب خدا کے پیچھے چلنا عبد سالک کو حبیبِ خدا بنا دیتا ہے اور اس مرتبے کا حصول مقامِ ولایت کا آغاز ہے کیونکہ ہر محب اپنے آثار محبوب کے ہاتھوں ظاہر کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مذکورہ حدیث میں بعد ازاں فرمایا گیا ہے:

"فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ولسانه الذی ینطق به ویده التی یبطش بها ان دعانی اجبته وان سألنی اعطیته"

اگر وہ میرا محبوب ہو گیا تو اس کی تمام ادراک و تحرک کی قوتوں کی حرکت کو میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ لہٰذا اگر وہ سمجھتا ہے تو میرے نورِ علم کے ذریعے سمجھتا ہے۔ اس لحاظ سے مسائلِ علمی میں نہ وہ پیچھے رہ جاتا ہے اور نہ سمجھنے میں غلطی کرتا ہے اور اگر وہ کام انجام دیتا ہے تو میری قدرت سے انجام دیتا ہے۔ لہٰذا اس کے کاموں میں عجز ہے نہ معصیت ایسے ہی مقام پر وہ اس خطاب سے مشرف ہوتا ہے:

"وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی"

(جب تم نے کنکریاں ماریں تو وہ تم نے نہیں ماریں بلکہ وہ اللہ نے ماریں)۔

(انفال - ۱۷)

البتہ یہ مسئلہ فقط کنکریاں مارنے سے مختص نہیں ہے بلکہ اس کا ذکر ایک مصداق کے عنوان سے کیا گیا ہے وگرنہ اس منزلت کو حاصل کر لینے والوں کیلئے قانونِ کلی یہ ہے: "وما فعلت اذ فعلت ولکن اللہ فعل"، "وما علمت اذ علمت ولکن اللہ علم"، یہ امور چونکہ صفتِ فعلِ خدا کی حدود میں آتے ہیں لہٰذا ان افعال کی اللہ تعالےٰ سے نسبت دینے میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی کیونکہ یہاں صفتِ ذات بیان نہیں کی جا رہی مقامِ ذات سے نسبت

تو دور کی بات ہے کہ جو عرفان نظری تک میں کسی قضیے کا موضوع نہیں۔

وہ کم ہمت سالکان کہ جو ہراس دوزخ کی وادی یا شوقِ بہشت کے بیابان میں ٹھہرے ہوئے ہیں یا ان دو منزلوں سے گزر چکے ہیں لیکن محبتِ خدا اور محبِ حق ہونے کو اپنی منزل سمجھ لیا ہے محبوبِ خدا ہونے کے انتہائی بلند مقام تک نہیں پہنچے بہت بلند ہمت مسلسل کوشش اور طاقت فرسا مجاہدہ اس گراں قدر الٰہی عطیہ کے حصول کیلئے ضروری ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ "دولت آن است کہ بی خونِ دل آید بہ کنار" کے مصداق کوئی بندہ بغیر خونِ دل کے مجذوبِ حق ہو جائے اور کوئی سالک بغیر خونِ جگر کے اس کا محبوب بن جائے۔

امیر المومنین علیہ السلام کا فرمان

نہج البلاغہ میں بھی اولیاء الٰہی کی یہ خصوصیت واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ ان ادراکی اور تحریکی قوتوں کو خداوندِ متعال خود ہی کنٹرول کرتا ہے علمی مسائل اور ادراکی قوتوں کے بارے میں آپؑ فرماتے ہیں:

"و انما سمیت الشبھۃ شبھۃ لانھا تشبہ الحق فاما اولیاء اللہ فضیاؤھم فیھا الیقین و دلیلھم سمت الھدیٰ و اما اعداء اللہ فدعاؤھم فیھا الضلال و دلیلھم العمیٰ"[1]

یعنی شبہ کو اس لیے شبہ کہا جاتا ہے کہ باطل حق کے مشابہ ہوتا ہے۔ اولیاء الٰہی جب شبہات کا سامنا کرتے ہیں تو وہ اپنے نورِ یقین اور ضیائے حق کی بدولت حق نما اور حق کو پہچان لیتے ہیں، ان میں تمیز کر لیتے ہیں اور اس خطرناک مقام سے سلامتی کے ساتھ نکل جاتے ہیں، جب کہ دشمنانِ خدا چونکہ ہر نور سے بے بہرہ ہوتے ہیں،

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳۸

اندھاپن اور گمراہی انھیں ہر طرف سے بلاتی ہے اور انھیں وحشت ناک گمراہی کے ہلاکت خیز گڑھے میں پھینک دیتی ہے اولیاءِ الٰہی کی درست بصیرت کی علامت یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کو بخوبی پہچان لیا ہے لہٰذا اپنے آپ کو اس کے گزند سے محفوظ رکھتے ہیں۔

"انّ اولیاء اللّٰہ ھم الذین نظروا الی باطن الدنیا اذا نظر النّاس الی ظاھرھا" [۱]

یعنی اولیاءِ الٰہی وہ ہیں کہ جب لوگوں کی نظریں ظاہرِ دنیا پر لگی ہوتی ہیں وہ باطنِ دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ظاہرِ دنیا شہوات اور نفسانی خواہشات سے پُر ہے جبکہ اس کا باطن شدید جلا دینے والی آگ ہے کیونکہ پیغمبرِ اسلامؐ کے فرمان کے مطابق "انّ النّار حفّت بالشّھوات" [۲] جیسا کہ مجاہدۂ نفس اور طریقِ الٰہی پر چلنا ظاہراً دشوار ہے لیکن ان مصائب و مشکلات کا اندرون بہشت ہے "انّ الجنّۃ حفّت بالمکارہ" [۳]

اس کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"واشتغلوا باٰجلھا اذا اشتغل النّاس بعاجلھا" [۴]

یعنی جب دوسروں نے زود گزر دنیا کے ظاہر کو نقد جان کر اختیار کر لیا تو انھوں نے آئندہ اور دور رس داخل اور درون کو اپنایا۔ مزید فرمایا: "فأماتوا منھا ما خشوا ان یمیتھم" [۵] یہ جانتے ہیں کہ دنیا کی ظاہری پر فریب چکا چوند انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ دنیا طلبی اور ہوس پرستی کی طرف سے انھیں کوئی نقصان پہنچے وہ دنیا اور اس کی چکا چوند کو شکست دیتے ہوئے انہیں ٹھکرا دیتے ہیں۔ آپ مزید فرماتے ہیں: "وترکوا منھا ما علموا انّہ سیترکھم" [۶] اور اس سے پہلے کہ وہ دنیا کے منصب و مقام سے معزول ہوں وہ خود منصب و مقام کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہ بات ایسے شخص نے

---

[۱] نہج البلاغہ۔ کلماتِ قصار نمبر ۴۳۲ [۵] نہج البلاغہ خطبہ ۔ ۱۷۵۔

فرمائی ہے جس کے ہاتھ میں حکومت تھی اور جو خلیفۂ وقت تھا البتہ خلافت اس کے قبضۂ قدرت میں تھی نہ کہ وہ خلافت کے قبضۂ قدرت میں " ورأوا استکثارغیر ھم منھا استقلالاً لکثرۃ دركھم لھا فوتاً "[1]

یعنی اولیاءِ الٰہی دیکھتے ہیں کہ جس چیز نے زراندوزوں کو اپنی طرف مشغول کر رکھا ہے اور ان کی نظروں میں اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے درحقیقت وہ بہت کم اور بے قدر و قیمت ہے کیونکہ " متاع الدنیا قلیل" اور اولیاءِ الٰہی اور اہلِ معنی کی نگاہ میں اس متاعِ قلیل کا حصول خیرِ کثیر سے ہاتھ دھونے کے برابر ہے۔

" اعداء ما سالم الناس وسلم ما عادی الناس بھم عُلم الکتاب وبہ علموا "[1]

جو کچھ لوگوں کے لیے صلح و سلامتی کا باعث ہے یہ لوگ (اولیاء خدا) اس سے جنگ و ستیز میں ہیں اور جو اُن کے لیے غصے اور دشمنی کا باعث ہے یہ اس سے صلح و دوستی رکھتے ہیں۔ قرآن کے علوم و معارف انہی اولیائے خدا کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح اولیائے الٰہی کا علم قرآن سے ہی لیا گیا ہے " وبھم قام الکتاب وبہ قاموا " احکامِ الٰہی انہی کے ذریعے برپا ہوتے ہیں اور ان کا قیام و قوام بھی قرآن کی شناخت اور اس پر عمل کرنے کی برکت سے ہے۔

لا یرون مرجوًّا فوق ما یرجون ولا مخوفاً فوق ما یخافون "[2]

اپنے خوف و رجا کے لیے خدا سے بالاتر کسی ہستی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ نتیجتاً جو شخص ولایتِ الٰہی کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے اس کے تمام ادراکی اور تحریکی پہلو افعالِ الٰہی کے مظاہر اور تجلی گاہ ہوں گے اور لازمی طور پر اس کے تمام افکار درست اور اس کے تمام اعمال صالح ہوں گے۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار ۴۳۲ [2] ایضاً ۔ ، ،

ولایت اور تفویض و توکیل میں فرق

آخری نکتہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے اور جس کے ذکر کے ساتھ ہم تیسری فصل کے مباحث کو سمیٹتے ہیں یہ ہے کہ ولایت اور تفویض میں فرق ہے۔ نیز ولایت اور توکیل میں بھی فرق ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ جو کوئی ولی اللہ ہو جاتا ہے اللہ تعالٰے عالمِ خلقت کا کوئی کام یا بعض کام اس کے ذمہ کر دیتا ہے جو پہلے خدا خود انجام دیتا تھا اس طرح سے کہ وہ ولی اللہ اپنی مرضی سے اور آزادانہ عمل کرے اور تفویض کا یہی مفہوم ہے یا اگر کسی کا ولایتِ الٰہی سے کوئی ربط نہ ہو بلکہ گناہوں کے ارتکاب کے باعث اس کی بارگاہِ مقدس سے دور ہو جائے تو اللہ تعالٰی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور درحقیقت اس کے کام خود اس پر چھوڑ دیتا ہے یا کسی اور کو واگذار کر دیتا ہے، توکیل کا یہی مفہوم ہے۔ بعض دعاؤں کے ظاہر سے بھی یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے مثلاً:

" الٰهی لا تَکِلْنِیْ الیٰ نفسی ....."

یا

" ولا تَکِلْنا الیٰ غیرك " (مفاتیح الجنان، اعمال مشترکہ ماہِ رجب)

لیکن اولیائے الٰہی کو بھی تفویضِ کار عقلاً و نقلاً محال ہے اور دشمنانِ خدا کو بھی توکیل ناممکن ہے۔ اس امر پر دو دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ چونکہ ربوبیتِ خدا لامحدود ہے لہٰذا اسے قطع کرنا ممکن نہیں، اس طرح کہ اس دنیا کے کسی گوشے میں کوئی کام چاہے وہ تکوینی ہو یا تشریعی کسی دوسرے کو واگذار ہوا ہو اور ربِ مطلق کا اس کے ایجاد کرنے میں یا اس کی بقا میں کوئی کردار ہو۔ لہٰذا محال ہے کہ تکوین و تشریع میں اللہ تعالٰے فرشتوں، نبیوں یا ولیوں کو کام تفویض کرے۔ اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ اللہ تعالٰے اپنے اعداء کو کام توکیل کر دے یعنی

انھیں ان کے حال پر اس طرح سے چھوڑ دے کہ ان کے کام میں بالکل مداخلت نہ کرے کیونکہ اس کی ربوبیت لامحدود اور ناقابلِ تقطیع ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ فقرِ موجوداتِ ممکن کا مقوم ذات[1] ہے اور جو چیز ذاتاً فقیر ہے اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑا جاسکتا، کیونکہ اس صورت میں وہ سرے سے معدوم ہو جائے گا اور دیگر کاموں کو اس کے سپرد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسے تو اپنے امور میں قیم و سرپرست کی ضرورت ہے دوسرے کے کام کی تو بات ہی اس سے بالاتر ہے لہٰذا دوسری دلیل کی حد وسط موجوداتِ ممکن کا فقرِ ذاتی ہے ان دونوں دلیلوں کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ انبیاء، اولیاء اور فرشتوں کو تفویض کار معقول ہے اور نہ اعداء الٰہی کے لیے توکیل ممکن ہے۔ خود انہیں ان کے حوالے کیا جاسکتا ہے اور نہ شیاطین کے۔

البتہ "اللّٰھم لا تکلنی الیٰ نفسی" کا مطلب یہ ہے کہ خدایا! اپنا وہ لطف خاص مجھ سے سلب نہ کر تاکہ میں شیطان کے تحت تدبیر نہ آجاؤں چونکہ اللہ اللہ تعالےٰ کی رحمت و ربوبیت دو طرح کی ہے ایک تدبیر عمومی کہ جو ربوبیت مطلقہ ہی ہے کہ جس کا ذکر ایسی آیتوں میں موجود ہے:

"الحمد للّٰہ ربّ العالمین"

"فللّٰہ الحمد ربّ السّمٰوات وربّ الارض ربّ العالمین"[2]

یہ ربوبیتِ مطلقہ اس قدر وسیع ہے کہ جو ہر ماسوا اللہ پر محیط ہے اس میں اولیائے الٰہی، ملائکہ، شیاطین، جنت اور جہنم وغیرہ سب شامل ہیں۔ دوسری ربوبیت اس کی رحمت و تدبیرِ خاص ہے کہ جو صرف بعض اولیائے الٰہی کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ موسیٰ کلیم اللہ سلام اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"انّ معی ربّی سیھدین" (شعراء-۶۲)

---

[1] یعنی ان کی ذات اسی فقر پر قائم ہے (مترجم) [2] جاثیہ - ۳۶

رسول اللہ فرماتے ہیں :

" ان اللہ معنا "[1]

دو طرح کی اس تدبیر اور ہدایت و رحمت کے ثابت کرنے کے لئے کئی شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے تمام چیزوں کے بارے میں اللہ تعالےٰ کے بصیر ہونے کی آیات ہیں اور یہ آیات قرآن کی آیاتِ محکمات میں سے ہیں، مثلاً۔

" انہ بکلّ شئ بصیر "[2]

اس کے باوجود بعض افراد کے بارے میں فرماتا ہے۔

" لا ینظر الیھم "[3]

(اللہ تعالےٰ ان کی طرف نہیں دیکھتا۔)

واضح ہے کہ کسی مورد میں بھی یہ بات عقل نہیں مانتی کہ کوئی چیز خدائے بصیر کی نظر میں نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی نظر دو طرح کی ہے، ایک عمومی نظر کہ جو ہر کسی اور ہر چیز کے بارے میں یکساں ہے اور دوسری اس کی نگاہِ لطف و کرم کہ جس سے فقط بندگانِ خاص مشرف ہوتے ہیں لہٰذا جس دعا میں ہے کہ " خدایا مجھے پلک جھپکنے کی مدت بھی خود مجھ پر نہ چھوڑ " اس سے مراد یہ ہے کہ اپنا لطفِ خاص ہمیشہ میرے شاملِ حال رکھ اور اپنی رحمتِ خاص کو لحظہ بھر بھی مجھ سے منقطع نہ فرما۔ اسی لیے مذکورہ جملوں کے ساتھ یہ عبارت بھی ذکر ہوئی ہے :

"۔۔۔ ولا تکلنا الی غیرك ولا تمنعنا من خیرك "

(اپنے غیر پر مجھے نہ چھوڑ اور اپنے خیر کو مجھ سے منقطع نہ فرما۔)

حاصلِ مطلب یہ کہ تفویض و توکیل عقلاً محال ہے لہٰذا اگر اولیاء الٰہی کے لئے تکوینی یا تشریعی ولایت ثابت ہو تو وہ تفویض کی صورت میں ہرگز نہیں ہے

---

[1] توبہ۔ ۴۰ [2] ملک۔ ۱۹ [3] آل عمران۔ ۷۷

بلکہ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ولایت فعل خدا کی صفات میں سے ہے اور صفاتِ فعل کو چونکہ مظاہرِ امکانی کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا یہ بندگانِ خاص اس ولیٔ مطلق کی ولایت کے مظاہر ہیں۔ نیز اگر بعض افراد پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور انہیں بشارت دیتے ہیں اور ان کے ایمان کو مضبوط کرتے ہیں تو یہ تفویض کی صورت میں نہیں ہے مثلاً یہ آیۂ کریمہ ملاحظہ ہو:

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون"[1]

(جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر استقامت کی ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہ خوف کھاؤ اور نہ حزن کرو اور تمہیں اس جنت کی بشارت ہو جس کا وعدہ تم سے کیا گیا ہے۔)

(وعبل نے ایک زبردست قصیدہ حریمِ ولایت کی پاسداری میں کہا تو امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

"نطق روح القدس علیٰ لسانک"[2]

(روح القدس نے تیری زبان سے کلام کیا ہے۔)

ان میں سے کوئی بھی تفویض کی صورت میں نہیں ہے۔

اسی طرح بعض دیگر آیاتِ قرآن اور روایات اہلِ بیت علیہم السلام اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اعداءِ الٰہی شیاطین کے زیرِ تدبیر آجاتے ہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

"انا ارسلنا الشیاطین علی الکافرین تؤزھم ازا"[3]

(ہم نے کافروں پر شیاطین کو اتارا ہے کہ جو انھیں بہکائے رکھتے ہیں۔)

---

[1] حٰمٓ سجدہ - ۳۰ [2] بحار ج ۴۹ ص ۲۳۷ [3] مریم - ۸۳

یا

"انا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون" [1]

(ہم نے شیاطین کو ایمان نہ لانے والوں کے اولیا قرار دیا۔)

یا

"ھل أنبئکم علیٰ من تنزل الشیاطین، تنزل علیٰ کل افاک اثیم" [2]

(کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کن لوگوں پر نازل ہوتا ہے وہ ہر جھوٹے بد کردار پر نازل ہوتا ہے)

البتہ آخری آیت کے بارے میں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ شیاطین کے لیے اوج و پستی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے بارے میں لفظِ تنزل کا استعمال اس تنزل کے معنی میں نہیں ہے جو فرشتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن چونکہ ہر فاسد شخص اپنے ولی یعنی شیطان کے زیرِ تسلط ہوتا ہے اور ہر ولی کو اپنے مولیٰ علیہ پر برتری حاصل ہوتی ہے، پس گویا وہ اس پر بلندی سے نازل ہوا ہوتا ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا آیات سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لاتعداد سپاہیوں میں سے شیاطین کا انتخاب کر کے انہیں اپنے دشمنوں پر مامور کرتا ہے جیسے سدھائے ہوئے کتے کو شکار پر بھیجا جاتا ہے اس حقیقت کا ذکر مولائے متقین امیر المؤمنین علیہ السلام نے بھی کیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"اتخذوا الشیطان لامرھم ملاکا واتخذھم لہ اشراکا فباض وفرخ فی صدورھم ودب ودرج فی حجورھم فنظر باعینھم ونطق بالسنتھم" [3]

یعنی انسان انتہائی پست ہوتے ہوئے اس مقام تک آ پہنچتا ہے کہ شیطان

---

[1] اعراف - ۲۷۔ [2] شعرا ۲۲۱ و ۲۲۲ [3] نہج البلاغہ خطبہ قمبر۔

اس کے اندر آشیانہ بنالیتا ہے اور پھر انڈے دیتا ہے اور اپنے بچوں کو اس کے اندر ہی پروان چڑھاتا ہے یہاں تک کہ اس کی زبان سے بولتا ہے اور اس کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

ع ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

(دیکھیں کہ دو گروہوں کے مابین فرق کس قدر ہے۔)

بعض افراد اس قدر اوج حاصل کر لیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالےٰ کی محبوبیت کی بلند چوٹی تک جا پہنچتے ہیں۔ خدا ان کی زبان سے کلام کرتا ہے اور ان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے جبکہ بعض اور اسی طرح کفر، فسق اور گناہ کے گڑھے میں جا گرتے ہیں کہ شیطان ان کی زبان، آنکھ اور کان کو مسخر کر لیتا ہے اور ان کے قوائے ادراک و تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

اسی وجہ سے سرور اولیاء راہ ولایت کے سالکوں کو خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«وحذرکم عدوًّا نفذ فی الصدور خفیًّا و نفث فی الآذان نجیًّا.» [۱]

یعنی خداوند تعالےٰ نے تمہیں ایک ایسے دشمن سے ڈرایا ہے جس کی راہ نفوذ بہت ظریف ہے۔ اس نے تمہاری جانوں میں نفوذ کیا ہے اور تمہاری فکر کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے اور تم سے کانا پھوسی کرتا ہے۔

اس کے بعد اصولِ کلی کو بعض مصادیق پر آپ تطبیق کرتے ہیں نیز اس شخص کا جواب دیتے ہیں جس نے آپ پر اعتراض کیا کہ ہمام پر آپ کے موعظہ کا اس طرح اثر ہوا کہ وہ غش کھا کر گرا اور مر گیا جبکہ خود آپ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا:

«ویحك انّ لكلّ اجلٍ وقتاً لا یعدوه، و سبباً لا یتجاوزه،

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۸۲

فمهلاً لا تعد لمثلها فانما نفث الشیطان علی لسانک [1]

یعنی ہر موت کا ایک خاص سبب ہوتا ہے۔ یہ اس امر کے لئے کنایہ ہے کہ یہ کلام سیلاب کے ایک ریلے کی مانند ہے ممکن ہے عام گھروں کو وہ اکھاڑ پھینکے اور بہالے جائے لیکن مجھ جیسے استوار اور با صلابت پہاڑ کے سامنے سیلاب کے اس ریلے کو مجال جسارت نہیں۔ پھر فرمایا کہ ہر بات کو یوں گستاخانہ اور عاجلانہ زبان پر نہ لاؤ کیونکہ یہ شیطان ہے جس نے تمہاری زبان سے گفتگو کی ہے۔ اس نے تمہارے اندر پھونکا اور تم اس کی پھونک کے نتیجے میں گویا ہوئے۔ برہان بھی اس بات کی تائید کرتی ہے۔ اس لیے کہ

(الف): انسان کے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ وجودی امور میں سے ہیں۔

(ب): امرِ وجودی اتفاقاً اور حادثاتی طور پر پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔

ج: انسان ان خیالات و افکار کے لیے سبب قابلی ہے نہ کہ سببِ فاعلی، کیونکہ ابتدا میں وہ یہ افکار و خیالات نہ رکھتا تھا، یہ بعد میں پیدا ہوئے۔

د: جب کوئی فعل فاعل کے بغیر ممکن نہیں تو یقیناً کوئی عامل ہے جس نے یہ فکر اس کے ذہن میں ڈالی ہے۔ ان مقدمات کی بنیاد پر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اگر فکر خیر ہو تو اس کا سبب فرشتہ ہے۔

"تتنزّل علیهم الملائکة" (حم السجدہ - ۳۰)

(ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں)

اور اگر فکرِ بد ہو اور اس کے ساتھ دعوتِ گناہ بھی ہو تو یقیناً اسے شیطان

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۴

لاتا ہے کہ

«تنزّل علیٰ کلّ افاکٍ اثیم». (شعراء - ۲۲۲)

[(شیطان) ہر جھوٹے بدکردار پر نازل ہوتا ہے۔]

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامِ ولایت کے حصول کا واحد ذریعہ احکامِ الٰہی کی اطاعت ہے، جس کے ذریعے انسان خدا کے قریب ہوتا ہے۔ اگر قربت کے ان مراحل سے گزر جائے اور محبوبِ حق تعالےٰ ہوجائے تو خداوند تعالےٰ اس کی ادراک و تحریک کی قوتوں کو اپنے ذمے لیتا ہے۔ محبوبانِ الٰہی قرآن کریم میں مشخص و معین کیے گئے ہیں:

«انّ اللہ یحبّ التوّابین ویحبّ المتطھّرین» [۱]

(بیشک خدا توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔)

«انّ اللہ یحبّ المقسطین» [۲]

(خدا عدل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔)

«انّ اللہ یحبّ الّذین یقاتلون فی سبیلہ صفًّا کانّھم بنیان مرصوص» [۳]

(بیشک اللہ تعالےٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر لڑتے ہیں۔)

یہ سب خدا کے محبوب ہیں۔ منطقی قیاس کے صغریٰ کو قرآن مجید نے بیان فرمایا جبکہ کبریٰ کو حدیثِ قدسی نے واضح کیا کہ جو بھی محبوبِ خدا ہو خدا اس کی ادراک و تحریک کی قوتوں کو اپنے ذمے لیتا ہے گویا ایک اصول کلی کے عنوان انھیں فرماتا ہے:

«وما فعلت اذ فعلت ولٰکنّ اللہ فعل»

---

[۱] بقرہ - ۲۲۲ [۲] مائدہ - ۴۲ [۳] صف - ۴

(اور جو کچھ تم نے انجام دیا در حقیقت تم نے انجام نہیں دیا بلکہ خدا نے انجام دیا ہے۔)

یہ چیز صرف تیر اندازی یا کنکریاں پھینکنے یا اسی طرح کے دوسرے کاموں سے مختص نہیں اور یہ ولایتِ الٰہی تفویض کے لحاظ سے بھی نہیں ہے جس طرح کہ خدا کی دشمنی بھی باعثِ توکیل نہیں ہوتی۔

والحمد للہ رب العالمین

○

درس ۱۴

ابھی تک ہم نے تین فصلوں میں ان عناوین کے تحت بحث کی: "الولایۃ ماھی"، "الولایۃ ھل ھی؟"، "الولایۃ لمن ھی"؟ گویا ہم نے اس بارے میں گفتگو کی کہ ولایت کیا ہے؟ اس کا وجود ہے بھی یا نہیں، نیز اس تک پہنچنے کا طریقہ کیا ہے؟ اب ہم چوتھی فصل میں "الولایۃ کم ھی؟" کے عنوان پر گفتگو کریں گے۔ اس میں ہم ولایت کی اقسام کا ذکر کریں گے۔ اس فصل میں تکوینی اور تشریعی لحاظ سے ولایت کی تقسیم کا ذکر ہوگا اور تشریع ایک اعتباری چیز ہے لہٰذا اصل بحث میں وارد ہونے سے پہلے چند مقدمات کے ذکر کی ضرورت ہے

① حقیقی اور اعتباری سے کیا مراد ہے۔

② نظامِ علی میں حقیقی اور اعتباری دونوں امور شامل ہیں۔

③ امورِ حقیقی اور اعتباری کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت۔

④ ولایتِ تکوینی اور تشریعی کا مفہوم۔

اب ہم ان مقدمات پر گفتگو کا آغاز کرتے ہیں:

مقدمۂ اوّل:

لفظ "اعتبار" کلمۂ "حقیقت" کے بالمقابل چند اصطلاحات کے لیے استعمال ہوتا ہے:

اصطلاحِ اوّل:

اس اصطلاح سے وجود کے حقیقی یا اعتباری ہونے کی بحث میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس اصطلاح میں اعتباری ہونے سے مراد بالعرض تحقیق پذیر ہونا ہے

مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ ماہیت امرِ اعتباری اور وجود امرِ حقیقی ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ تحقق سب سے پہلے اور ذاتاً وجود سے مربوط ہے اور اس کے بعد بالعرض ماہیت سے متعلق ہے۔

اصطلاحِ دوم:

یہ اصطلاح معقولات کی بحث میں استعمال ہوتی ہے۔ وہاں پر بعض معقولات کے وجود کو وجودِ اعتباری کہا جاتا ہے، جیسے مقولۂ اضافہ و نسبت جو طرفینِ اضافہ کے اعتبار سے موجود ہے۔

اصطلاحِ سوم:

یہ اصطلاح معرفت کے باب میں ادراکات کو تقسیم کرتے وقت استعمال کی جاتی ہے۔ یہ تقسیم مُدرَک اور ادراک شدہ چیز کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ اگر مُدرَک ماہیات کی طرح خارج میں موجود ہو تو اس کے ادراک کو ادراکِ حقیقی کہتے ہیں لیکن اگر منطقی معقولاتِ ثانیہ کی طرح ہو، مثلاً کلیت و جزئیت یا نوع، جنس اور فصل تو اس کے ادراک کو ادراکِ اعتباری کہتے ہیں جس کا وجود صرف ذہن میں ہوتا ہے لہٰذا شجر اور انسان کا ادراک ادراکِ حقیقی ہے، جبکہ کلیت اور نوعیت کا ادراک ادراکِ اعتباری ہے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا مختلف اصطلاحات میں استعمال ہونے والی یہ تقسیمات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ایک اصطلاح میں جو اعتباری ہے دوسری اصطلاح میں حقیقی ہے مثلاً اصطلاحِ اوّل میں انسان کی ماہیت ایک امرِ اعتباری ہے جبکہ تیسری اصطلاح میں اس کا ادراک حقیقی ہے۔

اصطلاحِ چہارم: یہ مذکورہ تمام اصطلاحات سے مختلف اور ان سب

کے بالمقابل ہے اور یہی مورد بحث ہے۔ اس اصطلاح میں حقیقی ان موجودات سے عبارت ہے جن کے ہونے یا نہ ہونے میں انسان کا اختیاری عمل دخیل نہیں ہے جبکہ اعتباری سے وہ اشیاء اور امور مراد ہیں جو انسانی حیات کے دائرۂ کار میں آتے ہیں، اس طرح سے کہ اگر انسان نہ ہو تو ان امور کی اصلاً بات ہی نہ ہو مثلاً ملکیت، سربراہی، زوجیت اور عضویت وغیرہ، گویا وہ تمام امور جو اخلاقی اور فقہی مسائل میں زیر بحث آتے ہیں۔ کیونکہ یہ فقط انسان ہے جو اپنے نظام زندگی کو چلانے کے لیے ان امور کا اعتبار کرتا ہے لہٰذا اگر انسان نہ ہو تو مالکیت اعتباری کا کوئی مفہوم ہے اور نہ عضویت، زوجیت یا دیگر اخلاقی و حقوقی مسائل کا کچھ اعتبار ہے۔

جس طرح پہلے اشارہ کیا گیا اعتباریات کی یہ چوتھی اصطلاح ہمارے زیر بحث ہے۔ البتہ اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ امور کی حقیقی اور اعتباری میں تقسیم اپنے اس معنی میں جو اصول میں اور کہیں کہیں فقہ میں بھی آتی ہے ایک فلسفی تقسیم ہے کیونکہ خود ہستی (وجود) اور موجودات کے وجود کی حقیقت سے بحث فلسفے کے ذمہ ہے۔ ہاں اگر کسی شے کا خود وجود فلسفے میں ثابت ہو تو اس وجود مقید کے عوارض سے بحث علوم جزئیہ کے مسائل میں شمار ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ اصول "الموجود اما حقیقی واما اعتباری" ایک فلسفی بحث ہے۔ یہ ثابت کرنے کے بعد کہ امور اعتباری وجود رکھتے ہیں ان علوم جزئی کے بارے میں بات کی جاتی ہے کہ جن کا محور یہ اعتباری امور ہیں اور اس کے لیئے ان مختلف اعتبارات کے حوالے سے کوشش کی جاتی ہے جو مختلف اغراض کے حصول کے لیے بنائے گئے ہیں۔

مقدمۂ دوم:

چونکہ کوئی بھی ایسا امر نہیں جو اتفاقی و حادثاتی طور پر بغیر کسی سبب فاعلی کے علت و معلول کی حدود سے باہر وجود میں آجائے لہٰذا تمام حقیقی اور اعتباری امور ایسی ہی علت کا سہارا لیتے ہیں جو انھیں ایجاد یا ان کا اعتبار کرتی ہے۔

مقدمہ سوم:

گذشتہ مباحث میں توحیدِ ربوبی کی بنیاد پر یہ ثابت ہوا کہ ہر وہ امر جو اس عالم میں تحقق پذیر ہو اور وجود و ہستی کہلا سکتا ہو، چاہے یہ امر حقیقی ہو یا اعتباری خداوند تعالےٰ ہی کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے۔

مقدمہ چہارم:

ولایتِ تکوینی اور ولایتِ تشریعی تکوین پر ولایت اور تشریع پر ولایت یعنی ولایۃ التکوین و ولایۃ التشریع کی طرف ہی لوٹتی ہیں کیونکہ جس طرح پہلے گزر چکا ہے علت معلول کے لیے سرپرست اور معلول علت کے تحتِ تربیت اور مولیٰ علیہ ہے۔ لہٰذا اگر علت کوئی حقیقی کام انجام دے، مثلاً کسی درخت یا انسان کو خلق کرے تو اس صورت میں علت اس امرِ تکوینی کی ولی یعنی ولی التکوین ہے اور اگر علت کوئی اعتباری کام انجام دے تو اس لحاظ سے علت ولیٔ اعتباری یا دوسرے الفاظ میں ولی التشریع ہوگی۔

اس بنا پر روحِ ولایتِ تشریعی جو قسیم ولایتِ تکوینی ہے تشریع پر ولایت کی طرف ہی لوٹتی ہے کیونکہ خود ولایتِ تشریعی کوئی تشریعی اور اعتباری امر نہیں بلکہ ایک امرِ حقیقی ہے کیونکہ جو قانون کو بناتا ہے وہ قانون پر ولی ہوتا ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک اعتباری امر پر ولی ہے نہ کہ اس کی ولایت ایک امرِ اعتباری ہے۔

البتہ ولایتِ اعتباری بھی وجود رکھتی ہے، مثلاً وہ ولایت جو شارع نے باپ کے لیے بیٹے کی نسبت قرار دی ہے۔ یہ ولایتِ اعتباری جو اپنی حدود میں شارع کی طرف سے مقرر کی گئی ہے اعتباری ہونے کے لحاظ سے ہرگز ولایتِ تکوینی کے مقابلے میں نہیں ہے بلکہ صرف وہ ولایت ولایتِ تکوینی کے مقابلے میں آتی

ہے جس کا ولی ذاتاً اور اصالتاً قانون سازی کا حق رکھتا ہو نہ کہ اعتباری اور قراردادی لحاظ سے۔ اور ایسی ولایت صرف خداوند تعالےٰ کی ولایت ہے جو قراردادی نہیں ہے، جب کہ دوسری ولایتیں یعنی انبیاء اور اولیاء علیہم السّلام کی قانون سازی پر ولایتیں سب قراردادی ہیں۔

گذشتہ بحث سے یہ روشن ہوگیا کہ ولایت کی تشریعی اور تکوینی میں تقسیم درحقیقت ایسی تقسیم ہے جو مولیٰ علیہ کی تقسیم کے ضمن میں انجام پاتی ہے۔ اگر مولیٰ علیہ امرِ تکوینی ہو تو ولی کی تکوین پر ولایت ہے اور اگر امرِ تشریعی ہو تو ولایتِ ولی سے مراد تشریع پر اس کی ولایت ہے۔

یہاں سے ارادے کی تکوینی اور تشریعی میں تقسیم کا معنی بھی واضح ہوجاتا ہے، کیونکہ ارادہ ایک صفتِ نفسانی ہونے کے لحاظ سے ہمیشہ ایک امرِ حقیقی ہے۔ البتہ یہ امرِ حقیقی "مراد" کے ضمن میں ارادۂ تکوینی اور ارادۂ تشریعی میں تقسیم ہوتا ہے کیونکہ "مراد" کبھی تکوینی ہوتی ہے اور کبھی اعتباری۔ یہ درحقیقت ارادہ کو ارادۃ التکوین اور ارادۃ التشریع میں تقسیم کرنے کے معنی میں ہے۔

ارادۂ تکوینی اور ارادۂ تشریعی کے درمیان فرق کو روشن کرنے کے لیے نیز یہ جاننے کے لئے کہ ان دونوں کا اختلاف "مراد" کی وجہ سے ہے، یہ کہا گیا ہے کہ متعلقِ ارادہ اگر خود انسان کا فعل ہو مثلاً بیٹھنا، اٹھنا وغیرہ، تو یہ ارادۂ تکوینی ہے لیکن اگر متعلقِ ارادہ کسی غیر کا فعل ہو تو یہ ارادۂ تشریعی ہوگا مثلاً حکم کے ذریعے کسی دوسرے سے کوئی چیز طلب کی جائے۔

خداوندِ عالم کے ارادۂ تکوینی اور ارادۂ تشریعی میں فرق یہ ہے کہ خداوند تعالےٰ کا ارادۂ تکوینی حتمی اور ناقابلِ تخلف ہوتا ہے۔ یعنی ممکن نہیں کہ خدا اپنے ارادۂ تکوینی سے کسی چیز کا ارادہ کرے اور پھر وہ واقع نہ ہو۔

"انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون"

(یقیناً امرِ خدا سے مراد یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے

کُنْ یعنی ہو جا پس ہو جاتی ہے) (یٰس - ۸۲)
پوری کائنات لشکرِ الٰہی کی حیثیت سے اس کے فرمانِ تکوینی کی مطیع ہے۔
" فقال لها و للارض ائتیا طوعاً او کرهاً قالتا اتینا طائعین"
(حٰمٓ السجدہ)

قرآنِ کریم اس ہمہ گیر اتباع کو اسلام اور سب کے سر بسجود ہونے سے تعبیر کرتا ہے۔ فرماتا ہے۔

" وله اسلم من فی السّموات و الارض "
(جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے حضور سرِ تسلیم خم کیئے ہوئے ہے۔) (آل عمران ۸۳)

یا

وللّٰه یسجد ما فی السّموات و ما فی الارض"
(جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ کے حضور سر بسجود ہے۔)
(نحل - ۴۹)

لیکن خدا کے ارادۂ تشریعی میں مخالفت ممکن ہے، کیونکہ خدا کے ارادۂ تشریعی میں اس ارادے اور خارجی فعل کے درمیان غیر کا ارادہ و عمل حائل ہو جاتا ہے۔ خداوند کریم اس طرح کے ارادے میں مکلّف انسان سے عمل چاہتا ہے اور چونکہ انسان خود مختار ہے لہٰذا کبھی اطاعت کرتا ہے اور کبھی سرکشی۔

خدا کی ولایتِ تکوینی اور تشریعی

مذکورہ مقدمات اور اصول کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا ولایتِ تکوینی بھی رکھتا ہے اور ولایتِ تشریعی بھی، اس لیے کہ توحیدِ ربوبی کے لحاظ سے خدا ہی ہے جو اپنی ولایت کو بروئے کار لاتے ہوئے " کون" کائنات کا نظام چلاتا ہے اور وہی ہے جو ہمیشہ مختلف پہلوؤں سے اپنی ربوبیت استعمال کرتا ہے؛

"كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ"

(وہ ہر روز ایک نئی شان میں ہے۔) الرحمٰن - ۲۹

وحی کو ثابت کرنے کے بعد اور نبوت کو قبول کرنے کی بنا پر خدا ہی قانون سازی کا حق رکھتا ہے اور وہی ہے جو بنے ہوئے قانون کو پیغمبرؐ کے ذریعے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ قرآنِ کریم جہاں قانون سازی خداوندِ عالم سے منسوب کرتا ہے وہاں مثال کے طور پر یہ بھی فرماتا ہے کہ پیغمبرؐ کو چاہیے کہ وہ ان بنے بنائے قوانین کو سنے اور انہیں لوگوں تک پہنچائے چنانچہ فرماتا ہے:

"لا تحرّك به لسانك لتعجل به انّ علينا جمعه و قرآنه"

(تو اپنی زبان کو اس کی تلاوت میں تعجیل کی غرض سے حرکت نہ دے کیونکہ اس کی جمع آوری اور اسے پڑھانا ہمارے ذمے ہے) (قیامت ۱۶-۱۷)

خداوندِ کریم کی ولایتِ تکوینی کے بارے میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ ان میں سے بعض آیات ولایتِ تکوینی اور تشریعی ہر دو کے بارے میں ہیں جبکہ بعض دوسری ولایتِ تشریعی سے مختص ہیں۔ من جملہ ان آیات میں سے جو ہر دو کے بارے میں ہیں معروف آیت، آیت الکرسی ہے:

"الله ولي الّذين امنوا يخرجهم من الظّلمات الى النّور"

(اللہ ایمان لانے والوں کا ولی ہے اور انھیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔) (البقرہ - ۲۵۷)

اس آیتِ کریمہ میں ولایتِ تشریعی اس لحاظ سے شامل ہوتی ہے کہ خداوندِ عالم نورانی قوانین بنا کر انسانوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

"كتاب انزلناه اليك لتخرج النّاس من الظّلمات الى النّور باذن ربّهم الى صراط العزيز الحميد" (ابراہیم-۱)

یعنی اے پیغمبرؐ! یہ قرآن تجھ پر نازل ہوا ہے تاکہ تو لوگوں کو نور کی طرف ہدایت کرے۔
پس مومنین کو نورانی کرنے کے لیے ولایتِ خدا احکام کو بنانے اور ان کے ابلاغ کرنے میں ہے۔ یہ احکام یا احکامِ تکلیفی ہیں مثلاً وجوب، حرمت، مستحب، مکروہ یا احکامِ وضعی ہیں مثلاً صحیح ہونا، باطل ہونا، طہارت، نجاست، وغیرہ۔

ولایتِ تکوینی کا اس آیت میں شامل ہونا اس جہت سے ہے کہ خداوند تعالیٰ توفیقات، میلانات اور انسان کے اندرونی جذبوں پر ولایت رکھتا ہے۔ اگر خداوندِ عالم کے یہ دو فرمان:

"اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ"[1]

اور "فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ واستغفر لذنبک و للمؤمنین"[2]

(پس خوب جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس اپنے گناہوں کی معافی مانگ اور مومنین کے لیے استغفار کر)

دو افراد کے لیے یکساں طور پر صادر ہوں اور پھر اس کے بعد ان دو افراد میں سے ایک کے لیے اطاعت و بندگی کی طرف کشش اور میلان حاصل ہو تو یہ درونی میلان کہ جو ایک امرِ تکوینی ہے اس کی باگ ڈور خداوندِ متعال کے ہاتھ میں ہے کہ جو تکوین پر ولی ہے۔

پس مذکورہ آیہ میں قانون و فقہ پر خدا کی ولایتِ تشریعی بھی شامل ہے اور انسانوں کے دلوں پر اسکی ولایتِ تکوینی بھی۔

خداوندِ عالم کی ولایتِ تشریعی پر دلالت کرنے والی آیات میں سے سورۂ احزاب کی آیت ۳۶ بھی ہے، جس میں فرماتا ہے:

---

[1] بقرہ - ۴۳ [2] محمد - ۱۹

« وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسوله امرًا ان یکون لهم الخیرة من امرهم ومن یعص اللہ ورسوله فقد ضل ضلالاً مبینا »

(اور کسی مومن یا مومنہ کے لئے مناسب نہیں کہ جب اللہ اور اسکا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے تو پھر اپنے اس امر میں ان کی کوئی (ذاتی) رائے (یا اختیار) رہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ صریحاً گمراہی میں مبتلا ہے۔)

یعنی اگرچہ تکوینا سب صاحبِ اختیار ہیں: "فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر"[۱] (جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے) لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا اور رسول کسی چیز کا حکم دیں تو وہ اس کی مخالفت کرتے ہوئے کسی اور چیز کو اختیار کرے اور جو کوئی بھی اس کی مخالفت کرے گا وہ واضح ضلالت اور گمراہی میں ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کی طرف کہ جو امر خدا کی مخالفت کریں عصیان و نافرمانی کی جو نسبت دی گئی ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس آیت میں خدا وندِ عالم کی ولایت اور فرمانِ تشریعی کی بات کی گئی ہے ورنہ جس طرح پہلے گزر چکا ہے خدا کی ولایتِ تکوینی کے مقابلے میں کسی کو عصیان و نافرمانی کی ہمت نہیں ہے۔

ایک اور آیت جس میں ولایتِ تشریعی کی بات ہوتی ہے سورۂ مبارکۂ نسا کی آیت ۵۹ ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے۔

« یا ایها الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم »

---

[۱] سورۂ کہف ۲۹ -

یعنی خدا، رسول اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔

جب توحید اور نبوت کی بحث مکمل ہو جائے تو خداوندِ عالم کی ولایتِ تکوینی اور تشریعی کی بحث بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ اس بات میں بھی جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ درحقیقت وہ فقط توجہ دلانے اور یاد دھانی کے لیئے ہے۔

البتہ جو چیز زیادہ اہم ہے وہ انبیاء و اولیائے الٰہی کیلئے ولایت کا ثابت کرنا ہے۔ چند مباحث کے ذریعے اس مسئلے کو روشن ہونا چاہیئے کہ کیا رسولِ خداؐ اور ائمہ ھدیٰ یا یہاں تک کہ اولیاء میں سے مومنین کے لیے بھی ولایت ثابت ہے یا نہیں؟ اور اگر ثابت ہے تو کیا ایک امرِ تشکیکی (شدت و ضعف) ہونے کے لحاظ سے مختلف درجات اور مراتب رکھتی ہے یا نہیں؟

یہاں زیادہ تر بحث اولیاءِ الٰہی کے لیے ولایتِ تکوینی کے اثبات سے مربوط ہے کیونکہ خداوندِ عالم کی طرف سے کسی ایسے شخص کے لئے کہ جو نبوت و رسالت پر مامور ہے ولایتِ تشریعی قرار دینا ایک واضح اور روشن سی بات ہے۔

والحمدللہ رب العالمین

درس ۱۵

عرضی اور طولی ولایتوں کی نفی

ولایتِ انبیاء اور اولیاء الٰہی پر بحث سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس مسئلے کی طرف توجہ دیں کہ اگر ولایتِ تکوینی یا تشریعی انبیاء، ائمہ ھدیٰ علیہم السلام اور دیگر اولیاء کے لیے ثابت ہو تو یہ ولایت، ولایتِ الٰہی کے مقابلے میں یعنی عرض میں ہرگز نہ ہوگی، بلکہ اس کے طول (یعنی ضمن میں) بھی نہیں ہوگی۔

کوئی بھی ولایت، ولایتِ الٰہی کے عرض میں یعنی مقابلے میں نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی کی بھی ولایت اصالت اور استقلال نہیں رکھتی۔ لہٰذا اس طرح کی ولایت کبھی بھی اصیل اور مستقل ولایت کے عرض میں نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح دوسروں کی ولایت، ولایت الٰہی کے ضمن میں یعنی طول میں بھی نہیں ہوسکتی۔ اس کی علت یہ ہے کہ خدا کہ جو "احد" و "صمد" ہے، کی ولایت بے حد و حصر ہے اور چونکہ یہ بے حد ہے لہٰذا کسی خاص حصے میں محدود نہیں ہوسکتی کہ اس حصے اور اس حد کے بعد کسی اور ولی کی ولایت کی نوبت آئے۔

وہ صمد ہے اور صمد کبھی بھی غیروں کے لیے خلا باقی نہیں رکھتا چہ جائیکہ وہ غیر دوسرے رتبے پر واقع ہو:

"للہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ"
(شرق و غرب سب خدا کے لیئے ہے۔ پس جس طرف بھی نظر کروگے اسی کا رخ دیکھوگے)۔ (بقرہ - ۱۱۵)

"ھو معکم اینما کنتم" (حدید - ۴)
(وہ آپکے ساتھ ہے چاہے آپ جہاں بھی ہوں)۔

"ھو الذی فی السماء اللہ و فی الارض الٰہ" (زخرف - ۸۴)

وہ آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی، بغیر اس کے کہ اس کی خدائی کی حدود پر آسمان و زمین کا کوئی رنگ پڑے یا گرد پڑے۔

"مع کل شیٔ لا بمقارنة" (نہج البلاغہ خطبہ اول)

(وہ ہر چیز کے ساتھ ہے بغیر اس کے کہ کسی کے ساتھ ملا ہوا ہو)۔

ولایتِ الٰہی کا ظہور اور اسکی تجلّی

جب ولایتِ الٰہی کے عرض میں یا اس کے طول میں ولایتوں کی نفی ہوگئی تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ہم ان ولایتوں کو کہ جو دوسروں سے منسوب ہیں مظہرِ ولایتِ خدا کہیں۔ یعنی ہر ولی کی ولایت چاہے وہ تکوینی ہو یا تشریعی درحقیقت مظہرِ ولایتِ الٰہی ہے، اس لحاظ سے کہ وہ شخص "مجلّی" (محلِ تجلّی) ہے اور خداوندِ عالم کی ولایت اس میں اپنی تجلّی کرتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں اللہ کی تجلّی کے بارے میں یوں حمد و ثنا کرتے ہیں:

"الحمد للّٰہ المتجلّی لخلقه بخلقه" (خطبہ ۱۰۷)

یعنی حمد اس خدا کی جس نے اپنی مخلوق کے لیے مخلوق کے ذریعے تجلّی کی۔

ولایتِ الٰہی کے ظہور اور اس کی تجلّی کے لیے بہترین مثال آئینے کی ہے کہ جو کچھ اس کے سامنے قرار پائے اس میں منعکس ہوتا ہے آئینہ ان اشیاء کے لیے مجلّی ہے جو اس کے سامنے ہوتی ہیں۔

آئینے میں موجود صورت کا جب صاحبِ صورت سے مقابلہ کیا جائے اور سوال کیا جائے کہ آئینے والی صورت کا کام کیا صاحبِ صورت کے کام کے عرض میں ہے یا طول میں، تو ممکن ہے ابتداء میں یہ کہا جائے کہ یہ کام صاحبِ صورت کے عرض میں نہیں بلکہ طول میں ہے۔ لیکن جب دقّتِ نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت آئینے میں تو کوئی چیز ہے ہی نہیں کہ صاحبِ صورت کے ضمن میں وہ کوئی کام انجام دے جو کچھ آئینے میں ہے وہ صاحبِ صورت کے لیے صرف ایک علامت

اور نشانی ہے اور صرف اس کی نشاندہی کرتی ہے۔

توحیدِ افعالی کی بنیاد پر یہ کائنات مظہرِ حق ہے اور قرآنِ کریم کی ظریف تعبیر کے مطابق آیتِ حق ہے۔ آیت اور نشانی کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا کیونکہ اگر کسی خصوصیت کے اعتبار سے اس کے پاس اپنا کچھ ہو تو اس خصوصیت میں وہ آیت اور علامت نہ ہوگی بلکہ حجاب ہوگی، جب کہ عالم اپنی ہر شان میں آیتِ الٰہی ہے اور کائنات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو کسی بھی جہت سے حجاب ہو اور آئینۂ حق نہ ہو۔

البتہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آئینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ عرف میں اسے آئینہ جانا جائے۔ عرف میں جسے آئینہ کہا جاتا ہے وہ تو شیشے کا ہوتا ہے جسے خاص کمیت اور کیفیت کے تحت مختلف شکلوں میں بنایا جاتا ہے شیشے کا جسم در حقیقت بالقوہ آئینہ ہے اور آئینۂ بالفعل کہ جو حقیقی آئینہ ہے وہی صورتِ مرآتیہ (آئینے کے اندر والی صورت) ہے جو صاحبِ صورت کی نشاندہی کرتی ہے۔ سراب کی طرح صورت مرآتیہ بھی نشاندہی کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی البتہ اس میں اور سراب میں فرق یہ ہے کہ سراب جھوٹ ہوتا ہے جبکہ آئینہ سچ اور درست چیز منعکس کرتا ہے۔

خلقت کے ضمن میں اللہ تعالٰے کے ظہور و تجلّی کے بارے میں جو کچھ ذکر ہوا اس سے پتا چلتا ہے کہ علومِ عقلی کی کتابوں میں علّت و معلول کے نظام کو روشن کرنے کے لیے جو مباحث پیش کی جاتی ہیں وہ صرف تعلیم و تعلّم میں سہولت کی خاطر ہیں اور فقط مقامِ اثبات پر دلالت کرتی ہیں نہ کہ مقامِ ثبوت پر۔ کیونکہ ان کتابوں میں ابتداء میں معمولی علتوں سے بحث شروع ہوتی ہے اور پھر انہی کے ضمن میں علّتِ غیبی اور وہاں سے علۃ العلل کہ جو مسبب الاسباب ہے پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن الٰہیات میں کیونکہ بحث کا آغاز مخصوص معنی میں علّتِ اوّل اور اس کے اوصاف سے ہوتا ہے اس لیے اس کے اہم ترین اوصاف میں سے ایک وصف جو ثابت کیا جاتا ہے وہ اس کا لامحدود ہونا ہے۔ اس کے اس وصف کے ثابت ہو جانے کے ساتھ

حضرت حق تعالیٰ کا دامنِ کبریائی ان تمام نقائص سے مبرّا و منزہ قرار پاتا ہے جو محدود ہونے کی صورت میں اس پر عارض ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ وَ مَنْ عَدَّهٗ فَقَدْ اَبْطَلَ اَزَلَهٗ" [۱]

"جس نے اسے (حق تعالیٰ کو) محدود جانا تو گویا وہ اس کے تعدد کا قائل ہو گیا۔ اور جو اس کے تعدد کا قائل ہو گیا، گویا اس نے اس کے ازلی ہونے کو باطل ٹھہرایا۔"

مقامِ ثبوت میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علتِ اولیٰ نامحدود ہونے کی بنا پر ہستی کے تمام سلسلۂ مراتب میں حضور رکھتی ہے اور اس سلسلۂ ہستی کی کوئی بھی فرد علتِ اولیٰ کے عرض (مقابل) یا طول (تسلسل) میں نہیں ہے۔

قیامت ـــــ حضرتِ حق کی ولایت کے ظہور کا مقام

جس مقام تک ایک حکیم اور فیلسوف آخر کار پہنچتا ہے اور جو تہذیبِ نفس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے کمالِ انقطاع کے مقام کا طالب ہے "اِلٰهِیْ هَبْ لِیْ كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْكَ" [۱] یا جیسے پانی میں ڈوبتا ہوا کوئی شخص جو تمام اسباب اور ظاہری علل سے منقطع ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کو خلوصِ نیت کے ساتھ پکارتا ہے اور "دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ" کا مصداق بنتا ہے، یعنی اگر کوئی شخص (مذکورہ دو صورتوں یعنی) برہان یا مشاہدہ و دیدار کے ذریعے حق تعالیٰ سبحانہٗ کی ولایت مطلقہ کو نہیں پا سکا تو ممکن ہے کہ وہ دنیوی سختیوں سے گزرنے کے بعد اس حقیقت کو پالے کہ:

"هُنَالِكَ الْوَلَایَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ" [۲]

---

[۱] مفاتیح الجنان، مناجاتِ شعبانیہ [۲] سورۂ یونس، آیت ۲۲

سورہ کہف میں اس شخص کے بارے میں کہ جس کا باغ خطرے سے دوچار ہے فرمایا گیا ہے:

" احیط بثمرہ فاصبح یقلب کفیہ علی ما انفق فیھا وھی خاویۃ علی عروشھا ویقول یالیتنی لم اشرک بربی احدًا ولم تکن لہ فئۃ ینصرونہ من دون اللہ وما کان منتصرًا "[1]

(اور اس کا پھل گھیر لیا گیا (آفت رسیدہ ہوا) اور وہ اس پر ہاتھ ملنے لگا جو اس نے اس پر خرچ کیا تھا اور وہ (باغ) بالکل تباہ و برباد ہو گیا اور کہنے لگا، اے کاش میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا اور اللہ کو چھوڑ کر اب کوئی جماعت نہ تھی کہ اس کی مدد کرتی اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو بچا سکا۔)

یعنی جب غیر خدا سے ولایت سلب ہو گئی اور جب نہ خود وہ کسی سے انتقام لے سکا اور نہ کوئی اس کی مدد کو آسکا، تو پھر وہ سمجھا کہ:

" ھنالک الولایۃ للہ الحق " (کہف - ۴۴)

ولایت اللہ سے مختص ہے۔

اگر اس مرحلے میں بھی کوئی ولایت الٰہی کو نہ پائے، تو پھر وہ برزخ اور قیامت کے سنگین حوادث کے بعد ولایت خدا کو پائے گا اور سمجھے گا کہ

" انّ اللہ ھو الحقّ المبین "[2]

بہر حال اگر یہ آگاہی دنیا کے تلخ حوادث کے ذریعے جسکی مثال سورۂ کہف میں بیان ہوئی ہے، حاصل ہو جائے تو ایمان کے حصول اور کفر کی تلافی کا امکان باقی رہتا ہے لیکن اگر اُخروی حوادث کے نتیجے میں حاصل ہو تو پھر اس پر ایمان کی کوئی

---

[1] کہف ۴۲-۴۳ [2] نور - ۲۵

گنجائش باقی نہیں رہتی، اس معنی میں کہ قیامت میں کافر ولایتِ حق کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن اس پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اسی وجہ سے قیامت کا ایک نام یوم حسرت ہے۔

قرآن میں ولایتِ الٰہی کی لامحدودیت

جیسے قرآنِ کریم میں الوہیت کے بارے میں دو طرح سے ذکر ہے ولایت کے بارے میں بھی دو پیرایوں میں بات کی گئی ہے۔ الوہیت کے ذکر میں ایک دفعہ اسے اللہ میں منحصر قرار دیا گیا ہے اور دوسری دفعہ غیرِ خدا سے الوہیت کی نفی کی گئی ہے۔ ولایت کے بارے میں بھی ایک دفعہ اسے اللہ میں منحصر قرار دیا گیا ہے مثلاً سورۂ شوریٰ کی آیت ۹ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

" فاللہ ھو الولیّ "

اور اسی سورت کی آیت ۲۸ میں ہے:

" وھو الولیّ الحمید "

جبکہ دوسرا انداز یہ ہے کہ غیرِ خدا سے ہر طرح کی ولایت کی نفی کی گئی ہے مثلاً سجدہ آیت ۴ میں ہے:

" اللہ الذی خلق السّمٰوات والارض وما بینھما فی ستّۃ ایّام ثمّ استوٰی علی العرش مالکم من دونہ من ولیّ ولا شفیع "

(اللہ ہی وہ (ذاتِ اقدس) ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اسے چھ دنوں میں خلق کیا، پھر عرش پر جلوہ افروز ہوا۔ تمہارا اس کے سوا کوئی سرپرست و شفیع نہیں۔)

وہ دلائل جن میں اللہ تعالےٰ کے لئے ولایت کے اثبات کا انداز اپنایا گیا ہے ان کی طرف قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے، ہر چند کہ ولایت کو اللہ میں منحصر کرنے

کا لازمہ غیر خدا سے ولایت سلب کیا جانا ہے لیکن اس حوالے سے بھی چند ادلّہ وارد ہوئی ہیں، اب ہم ان کا ذکر کرتے ہیں:

برہانِ اول:

اس کا ذکر سورۂ کہف کی آیت ۵۰ اور ۵۱ میں ہے۔

"أفتتخذونه وذرّيته اولياء من دوني وهم لكم عدو بئس للظالمين بدلاً ما اشهدتهم خلق السّموات والارض ولاخلق انفسهم"

(تو کیا تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی ذریت کو دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ (افسوس) ظالموں نے کیا ہی برا بدل اختیار کیا ہے۔ میں نے انہیں آسمانوں اور زمینوں کی خلقت پر گواہ نہیں بنایا تھا اور نہ ہی ان کی اپنی خلقت پر۔)

اس برہان کی حدِ وسط علم ہے کیونکہ ولی وہ ہے جو مولیٰ علیہ (تحتِ ولایت) سے باخبر ہو۔ لہٰذا جو دوسروں سے بے خبر ہے وہ ان کا ولی نہیں ہو سکتا۔ مندرجہ بالا آیات میں فرمایا گیا ہے کہ جو اس نظام (کائنات) کی خلقت کے وقت حضور و شہود نہ رکھتے تھے (یعنی موجود نہ تھے) وہ اس نظام سے آگاہ بھی نہیں ہیں لہٰذا ہرگز اس کے ولی نہیں ہو سکتے اور اگر ولایت کا دعویٰ کریں بھی تو جھوٹے ہیں۔

برہانِ دوم:

سورۂ کہف کی آیت ۵۱ میں اس برہان کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

"وماكنت متخذ المضلّين عضداً"

(اور میں گمراہوں کو اپنا بازو بنانے والا نہیں۔)

برہان دوم کی حدِ وسط قدرت ہے کیونکہ ولی وہ ہے جو اپنے ماتحتِ ولایت کا نظام چلانے کی قدرت رکھتا ہو۔ جھوٹے اولیاء کیونکہ خلقت میں پروردگار کے مددگار نہیں تھے اور آفرینش میں ان کا کردار نہیں تھا اس لیے وہ ہرگز ولی نہیں ہو سکتے۔

وہ سب لوگ جنہوں نے جھوٹے اولیاء کے حضور گردن جھکا رکھی ہے ان کے لیے یہ دو برہان تام و مکمل ہیں۔ یعنی ان کے لیے بھی جنہوں نے شیاطین کو اپنا ولی بنایا ہے اور ان کے لیے بھی جو ستاروں اور ملائکہ کو اربابِ متفرقہ کی حیثیت سے پوجتے ہیں، یہ دو برہان حق تعالےٰ کی حجتِ بالغہ ہیں۔ لہٰذا سورۂ کہف کی مذکورہ آیت سے قبل اور بعد کی آیات میں فرمایا گیا ہے کہ انسان یا دلیل سے سمجھ جائے اور یا ماسوا اللہ سے منقطع ہو کر مشاہدہ کرے کہ ولایت حضرتِ حق سے مختص ہے ۔ ھنالک الولایۃ للہ الحق ، یا پھر دنیاوی اور برزخی سختیوں کے نتیجے میں یہ حقیقت آشکار ہو جائے۔

برہانِ سوم و چہارم :

کبھی انسان اپنے اوپر اختیار کی باگ ڈور بتوں کے سپرد کر دیتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھتے ہوئے خیال کرتا ہے کہ اپنے نظام کو چلانے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس صورت میں بھی وہ ایک ایسا بت پرست ہے جس کا نظام نفسانی خواہشات کہ جنہوں نے اس کے تبکدہ کو بھر رکھا ہے، کے ماتحت چلتا ہے۔ وہ تمام افراد جنہوں نے اپنا نظامِ حیات غیرِ خدا کے سپرد کر رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ غیر پر بھروسہ کر کے وہ اپنے لیے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں یا اپنے آپ سے ضرر دور کر سکتے ہیں، ان کے خلاف استدلال کے لیے قرآن سورۂ رعد کی آیت ۱۶ میں فرماتا ہے:

" قل من رب السمٰوات والارض ط قل اللہ ط

یعنی آپ سے پوچھئے کہ آسمانوں اور زمینوں کا نظام کون چلاتا ہے اور چونکہ ان

کے پاس کوئی قانع کنندہ جواب نہیں ہے تو آپ خود ہی جواب میں کہہ دیں اللہ۔ اور یہ وہی جواب ہے جس کا اقتضا ان کی فطرت کرتی ہے۔ وہ ارباب متفرق میں گرفتار ہیں اگرچہ اللہ تعالے کو رب الارباب اور خالق مانتے ہیں لیکن جزوی ربوبیت کی غیر خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ سورۂ لقمان میں مشرکینِ مکہ کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ خالقیتِ خدا کا اقرار کرتے ہیں:

"ولئن سألتھم من خلق السمٰوات والارض لیقولن اللہ"

یعنی اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا ہے تو کہیں گے، اللہ نے۔ (لقمان - ۲۵) (زمر - ۳۸)

لیکن سورۂ رعد کی وہ آیت جو ہماری موضوع بحث ہے اللہ تعالےٰ کی ربوبیت کو بیان کرتی ہے کیونکہ یہ ربوبیت ہی ہے جو مسئولیت کا باعث بنتی ہے۔

مذکورہ آیت میں قرآنِ کریم غیرِ خدا سے سلب ولایت پر استدلال کو یوں پیش کرتا ہے:-

"قل أفاتخذتم من دونہ اولیاء لایملکون لانفسھم نفعًا ولاضرًّا"۔

یعنی تم نے خدا کی جگہ دیگر ایسے اولیاء اختیار کر رکھے ہیں جو نہ تو نفع بخش ہیں اور نہ ہی دفع ضرر کر سکتے ہیں۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ وہ لوگ جو جھوٹے اولیاء کی پرستش کرتے ہیں یا تو خوف کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں یا شوق کی بنا پر اور یا پھر آزادانہ طور پر یعنی ان کی عبادت خوف و شوق سے خالی ہے اور وہ ہرگز اندرونی یا بیرونی بتوں کی پرستش جیسی ذلت میں مبتلا نہیں ہوتے۔ مذکورہ گروہ کی عبادت چونکہ خوف یا شوق کی بنا پر ہوتی ہے لہٰذا قرآنِ کریم ان کے خلاف استدلال کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم اس کی عبادت میں مصروف ہو جس سے تمہیں توقع ہے کہ وہ تمہارے لیے نفع بخش ہوگا یا دفع ضرر کرے گا۔ حالانکہ ان دونوں میں سے وہ کسی پر قادر نہیں۔

یہ دو برہان منطقی قیاسوں کی چار صورتوں میں سے دوسری صورت میں بیان کیے

گئے ہیں اور وہ اس طرح کہ بت نفع بخش یا ضرر رساں نہیں ہیں اور خدا وہ ہے جو نفع بخش اور ضرر رساں ہو، پس بت خدا نہیں ہیں۔

یہ دو استدلال اندرونی بتوں کی نفی کے لیے جاری ہوتے ہیں اس لیے کہ قرآن کریم ایک اور جگہ پر ایسے لوگوں کو جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے امور چلا رہے ہیں فرماتا ہے: "اے رسولؐ! انہیں کہہ دیجئے:

"لا املك لنفسي نفعاً ولا ضراً" (اعراف - ۱۸۸)

یعنی نہ فقط میں بلکہ کوئی بھی انسان اپنے نفع و ضرر پر قادر نہیں۔

سورۂ رعد کی آیت ۱۶ میں مذکورہ دو استدلال کے بعد اساس استدلال کی طرف لوٹتے ہوئے فرماتا ہے:

"قل هل يستوي الاعمىٰ والبصير، ام هل تستوي الظلمات والنور ام جعلوا لله شركاء خلقوا كخلقه فتشابه الخلق عليهم قل الله خالق كل شيء وهو الواحد القهار۔"

یعنی مومن اور غیر مومن کی مثال نابینا اور بینا یا ظلمات اور نور کی طرح ہے۔ کیا خدا کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے یا کیا اس کا غیر کسی کام پر قادر ہے کہ جو اشتباہ کا باعث بنتا ہو اور گمان ہوتا ہو کہ اسکے علاوہ کوئی اور مخلوق کی پرورش اور ان کے نظام کو چلانے پر قادر ہے؛ اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دیجئے کہ خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ اس اصول کو مشرکین اور وثنیوں نے بھی قبول کیا ہے کہ خدا خالق ہے جس چیز کا وہ انکار کرتے تھے اور یہ انکار ہی ان کے لیے اشتباہ کا باعث بنتا تھا وہ بعد کا جملہ ہے کہ فرماتا ہے:

"وهو الواحد القهار۔"

یعنی خدا وحدت قاہرہ رکھتا ہے۔ اگر اس کی وحدت، وحدت قاہرہ ہو تو اس کے ضمن میں کوئی غیر نہیں ہو سکتا کہ انسان اشتباہاً اس غیر کو دفع ضرر کے لیئے یا حصول منفعت کے لیے ولی اور رب کے عنوان سے ولایت کے لیے قبول کرے۔

والحمد للہ رب العالمین

درس ۱۶

برہان پنجم:

سرپرستی اور تدبیر کے معنی میں ولایت کی بحث چونکہ کسی خاص لفظ سے مختص نہیں لہٰذا خداوند عالم کی حاکمیت کے بارے میں آیات بحثِ ولایت کی سند بن سکتی ہیں۔

الٰہی حاکمیت قرآنی آیات کی نظر میں

اللہ تعالےٰ کی حاکمیت کے بارے میں وارد شدہ آیات کی چند قسمیں ہیں ان میں بعض نے غیرِ خدا کی حاکمیت کی بطور مطلق نفی کی ہے اور حاکمیت کو اللہ تعالےٰ کیلئے ثابت کیا ہے، جیسا کہ سورۂ یوسف کی آیت ۴۰ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا انتم و آباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان الحکم الا للہ"

اس آیت میں غیرِ خدا سے ہر قسم کی تکوینی اور تشریعی حاکمیت سلب کی گئی ہے اور حکم کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے اور اس کے بعد حکمِ خداوندی کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"امر الا تعبدوا الا ایاہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون"

بعض آیات صرف اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ حاکم ہے جبکہ بعض دیگر آیات غیرِ خدا سے حاکمیت کو سلب کرتی ہیں۔ اسی طرح کچھ اور آیات مانع اور رکاوٹ کی نفی کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ جس طرح اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں اسی طرح اس کے حکم کے سامنے بھی کوئی رکاوٹ موجود نہیں۔

سورۂ مبارکہ کہف کی آیت ۲۶ میں ہے:

"مالھم من دونہ من ولی ولا یشرک فی حکمہ احداً"

اس مفہوم کی اور بھی کئی ایک آیات ہیں۔

غیرِ خدا سے سلبِ حاکمیت:

اللہ تعالےٰ کے حکم میں کسی کے شریک نہ ہونے کا راز سورۂ سبأ میں مشخص کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے! اگر خدا کے علاوہ کوئی اور تشریع یا تکوین میں سلطنت یا اثر و رسوخ کا خواہاں ہو تو اسے درجِ ذیل عہدوں میں سے کسی ایک پر فائز ہونا چاہیئے جب کہ یہ تینوں باطل ہیں۔ اور وہ تین عہدے یہ ہیں:

یا تو وہ ذرّاتِ عالم میں سے کسی ایک ذرے کا خود "بالاستقلال" مالک ہوتاکہ نتیجتاً وہ اس پر خود مختار حاکم اور ولی ہو اور یا یہ کہ وہ بالاشتراک خدا کی مِلک و مُلک میں اس کا مددگار ہو۔

یہ تین صورتیں حصرِ عقلی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کتبِ علومِ عقلی کے مطابق اس میں دو منفصلۂ حقیقیہ قضیے بنتے ہیں کیونکہ حصرِ عقلی میں ایک چیز وجود و عدم یعنی دو نقیضوں میں دائر ہوتی ہے اور ہر چیز چونکہ ایک سے زیادہ نقیض نہیں رکھتی لہذا جو قضیۂ منفصلہ حصرِ عقلی بیان کر رہا ہو اس کے دو سے زیادہ پہلو نہیں ہو سکتے۔

منفصلۂ حقیقیہ میں حصر کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مقدم و تالی ایک دوسرے کے نقیض ہوتے ہیں اور چونکہ قانون یہ ہے کہ دو نقیضوں کا ارتفاع بھی محال ہے اور اجتماع بھی، لہٰذا نہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ مقدم و تالی ہر دو سچ ہوں اور نہ ہی یہ کہ ہر دو جھوٹ ہوں۔

سورۂ سبأ میں دو منفصلۂ حقیقیہ قضیوں کی صورت میں جو کچھ ذکر ہوا ہے اس کا تحلیل و تجزیہ یہ ہے کہ:

اگر غیرِ خدا مالک ہو تو اس کی مالکیت یا بالاستقلال ہے یا نہیں۔ اور اگر

بالاستقلال نہ ہو تو یا بالاشتراک ہے یا نہیں۔

یہ آخری صورت کہ جس میں مالکیت نہ تو بالاستقلال ہے اور نہ ہی بالاشتراک درحقیقت مالکیت ہی نہیں بلکہ ملک میں ایک طرح کا اثر و رسوخ اور تسلط ہے کہ جسے معاونت اور مدد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ تین قسمیں سورۂ سباء کی آیت ۲۲ میں یوں بیان کی گئی ہیں:

"قل ادعوا الذین زعمتم من دون اللہ"

یعنی خدا کے علاوہ جن کے بارے میں تم گمان کرتے ہو اور ان پر اعتماد کرتے ہو انہیں بلاؤ۔ اس حالت میں تم دیکھو گے کہ وہ:

"لا یملکون مثقال ذرۃ فی السمٰوات ولا فی الارض"

جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اس میں سے ایک ذرہ بھر کے مالک نہیں ہیں۔

"وما لھم فیما من شرک"

نہ فقط بالاستقلال ذرہ بھر کے مالک نہیں بلکہ بالاشتراک بھی مالک نہیں ہیں۔

"وما لہ منھم من ظھیر"

اگر کوئی بالاستقلال یا بالاشتراک مالک نہ ہو تو صرف مددگار ہونے کے لحاظ سے ملک میں اس کا اثر و رسوخ ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالےٰ نے انہیں اپنے لیے مددگار بھی نہیں بنایا۔

ان تین پہلوؤں کی نفی سے پتا چلتا ہے کہ ذراتِ عالم میں سے کسی ذرّے میں بھی غیرِ خدا کا کوئی عمل دخل نہیں۔

سورۂ توحید کی اس آیت سے بھی غیر اللہ سے حاکمیت کے مطلقاً سلب ہونے کا استفادہ ہوتا ہے:

"ولم یکن لہ کفوًا احد"

کیونکہ اگر اللہ تعالےٰ مطلقاً فاقدِ کفو ہے اور مطلقاً اس کا کوئی ہمسر نہیں تو مالکیت

میں بھی وہ بغیر کفو کے ہوگا اور شریک و مددگار کے لحاظ سے بھی اس کا کوئی ہمسر نہ ہوگا، جیسا کہ اس کی ذات، وصف اور فعل میں بھی کوئی ہمسر نہیں۔

گذشتہ ابحاث سے سورۂ کہف اور یوسف کی ان دو آیات کا معنی بھی واضح اور قابلِ استدلال ہو جاتا ہے:

"مالھم من دونہ من ولیّ ولا یشرک فی حکمہ احداً" (کہف - ۲۶)

"ان الحکم الا للہ" (یوسف - ۴۰)

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں چونکہ تکوینی اور تشریعی لحاظ سے کوئی شریک نہیں لہٰذا سورۂ کہف کی آیت ۱۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

"من یھد اللہ فھو المھتد و من یضلل فلن تجد لہ ولیّاً مرشداً"

جسے خدا ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جو ہدایتِ الٰہی سے بہرہ مند نہ ہو وہ ایسا ہے کہ جس کا نہ تو کوئی ولی ہے اور نہ ہی کوئی راہنما۔ یہاں نکرہ نفی کے ضمن میں آیا ہے کہ جس سے عمومیت کا استفادہ ہوتا ہے پس اس آیت میں اللہ کے فرمان کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی ہدایتِ الٰہی سے بہرہ مند نہ ہو تو وہ مسائلِ تشریعی اور قانون سازی میں بھی گمراہ ہے اور مسائلِ تکوینی اور توفیقات میں بھی۔

غیرِ خدا سے حاکمیت کے مطلقاً سلب ہونے کی بنا پر ہی سورۂ رعد کی آیت ۴۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

"واللہ یحکم لا معقب لحکمہ"

یعنی حکمِ خدا کے مقابلے میں کوئی بھی ایسا وجود نہیں کہ جو اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس میں قصدِ نفوذ رکھتا ہو۔

سورۂ انعام کی آیہ ۵۷ میں بھی یہی مطلب ذکر ہوا ہے۔

"ان الحکم الا للہ یقص الحق"

حکمِ الٰہی اور حکمِ جاہلی :

مذکورہ تین پہلوؤں کو دو منفصل منطقی قضایا کی صورت میں بیان کرنے اور یہ جاننے کے بعد کہ کوئی موجود بھی انسان کے مختلف حالات میں بطور استقلال، بطور اشتراک یا مددگار کی حیثیت سے ذرہ بھر اثر و رسوخ نہیں رکھتا، یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حق تعالےٰ کے علاوہ کوئی اور نہ تو انسان کی پرورش پہ قادر ہے اور نہ ہی کوئی ایسا قانون بنا سکتا ہے کہ جس کا انحصار تکوین پہ ہو کیونکہ جو بھی اللہ کے سوا کسی اور پہ بھروسہ کرے چاہے وہ اپنی فکر پر بھروسہ کرتے ہوئے کوئی حکم لگائے یا دوسرے دانشوروں کے افکار سے استفادہ کرے، ہر دو صورت میں وہ اس حکم کے بارے میں جاہل ہے۔

یہاں جاہل سے مراد عاقل کے مقابلے میں جاہل ہے نہ کہ عالم کے مقابلے میں۔ پس اگر کوئی خاصا پڑھا لکھا ہو اور سائنسی علوم اور اسی طرح کے دیگر علوم کو جانتا ہو لیکن الٰہی قوانین کے تابع نہ ہو تو وہ جاہل ہے کیونکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ حکم کا اختیار اُس کے ہاتھ میں ہو جو مِلک و مُلک میں وخالت رکھتا ہو۔ اسی بنا پر قرآنِ مجید نے حکم کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے ایک جاہلی اور دوسرا الٰہی۔ ارشاد ہوتا ہے :

"أفحکم الجاهلیة یبغون ومن احسن من الله حکماً لقوم یوقنون"[1]

اگر کوئی پرورشِ انسان کو غیر خدا کے سپرد کرے تو اس نے قانونِ جاہلیت کی پیروی کی ہے کیونکہ خدا کے علاوہ کوئی بھی مذکورہ کسی لحاظ سے انسانی حالات و اطوار میں سے کسی کا مالک نہیں چہ جائیکہ وہ قانون سازی کا حق رکھتا ہو۔

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت ۵۰۔

عقل تو وہ ہے کہ جس کے ذریعے عبادتِ خدا کی جائے اور بہشتِ رضوان حاصل کی جائے۔

"العقل ما عُبد به الرحمٰن واکتُسب به الجنان"[1]

لہٰذا عاقل وہ ہے جو اللہ کی عبادت کرے اور احسن الاحکام پر کہ جو اہلِ یقین کو معلوم ہے عمل کرے اور اگر اس کے علاوہ وہ کسی اور راہ پر چلے تو جہالت و گمراہی کا شکار ہو جائے گا کیونکہ:

"فماذا بعد الحق الا الضلال"[2]

اور اس جہالت کے لحاظ سے پہلی اور دوسری جہالت کے درمیان کوئی فرق نہیں قرآنِ مجید ان لوگوں کی نہ صرف جہالت و ضلالت سے توصیف کرتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے وہ نہیں مانتے، بلکہ انھیں کافر، فاسق اور ظالم بھی کہتا ہے۔

سورۂ مبارکہ مائدہ کی آیت ۴۴ میں تورات اور دیگر کتبِ آسمانی میں احکامِ الٰہی کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون"

اور اسی سورہ کی آیت ۴۵ میں فرماتا ہے:

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون"

نیز آیت ۴۷ میں فرماتا ہے:

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون"

---

[1] اصول کافی کتاب عقل وجہل حدیث نمبر ۳ [2] یونس ۔ ۳۲

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اوپر والی آیات میں سے کسی میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ اگر کوئی شخص جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کے علاوہ کوئی حکم کرے تو وہ کافر، فاسق یا ظالم ہے بلکہ یوں فرمایا ہے کہ اگر کوئی جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے (اس کے مطابق) حکم نہ کرے تو وہ مذکورہ صفات کا حامل ہے۔ جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کے مطابق حکم نہ کرنا عدمِ ملکہ[1] ہے اس معنی میں کہ اگر کسی معاشرے میں حکم بما انزل اللہ (اللہ کی طرف سے نازل شدہ حکم) کے لیے فضا سازگار ہو اور انسان اس کی انجام دہی میں کوتاہی کرے تو یہی چیز باعث بنتی ہے کہ کفر و فسق و ظلم کے عناوین اس پر صادق آئیں۔ سورۂ مبارکہ نساء کی آیت ۶۵ میں شرطِ ایمان کے بارے میں اس طرح آیا ہے:

"فلا و ربّك لا یؤمنون حتّیٰ یحکّموك فیما شجر بینهم ثمّ لا یجدوا فی انفسهم حرجاً ممّا قضیت ویسلّموا تسلیماً"

یعنی وہ ہرگز مقامِ ایمان تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ وہ اپنے اختلافات میں تجھے حکم قرار نہ دیں۔ مشاجرہ، آراء میں اختلاف کے معنی میں ہے کیونکہ مختلف افکار جب آپس میں جڑی ہوئی (اشجار) درختوں کی ٹہنیوں کی طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں تو اس حالت کو مشاجرہ کہتے ہیں[2] اور اگر افکار کے ساتھ بھی درخت کی ٹہنیوں جیسا سلوک کیا جائے تو ایسی صورت میں باغبان کو قضاوت کے لیے بڑنا ہوگا تاکہ وہ کسی ایک (ٹہنی) کو بچا کر دوسری کو کاٹ دے اور یوں ان کے درمیان عدالت اور نظم کو برقرار رکھے۔ اس نظامِ خلقت کا باغبان چونکہ اللہ تعالےٰ ہے "واللہ انبتکم من الارض نباتاً[3]" لہٰذا وہی ان مشاجرات اور اختلافات کو

---

[1] یہ علمِ منطق کی ایک اصطلاح ہے (مترجم)

[2] مشاجرہ اصل میں شجر ہی سے مشتق ہے۔ [3] نوح - ۱۷

ختم کرنے پر قادر ہے اور مومن وہ ہے کہ جو اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قبول کرلے۔ دوسروں کی حاکمیت کو قبول کرنے کے برعکس اللہ کی حاکمیت کو قبول کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف حاکم کے حکم کے سامنے سکوت اختیار کیا جائے بلکہ یہ سکوت، قبولیت اور تولّی کے ہمراہ ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی آیہ میں مومنین کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ ایسے ہیں کہ جب کوئی حکم دیا جائے تو نہ صرف دل میں بے چینی کا احساس نہیں کرتے بلکہ اسے دل وجان سے قبول کرتے ہوئے شرحِ صدر کے ساتھ کمرۂ عدالت سے باہر آتے ہیں۔

حاکمیتِ نبیؐ اور احکامِ الٰہی کا پیش کرنا

سورۂ مبارکہ نساء میں حکمِ رسولؐ اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو شرطِ ایمان قرار دینے کے بعد آیت ۱۰۵ میں آپؐ کی حاکمیت کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

«انّا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین النّاس بما اراٰک اللہ ولا تکن للخائنین خصیماً»

[اے رسولؐ) ہم نے تم پر برحق کتاب اس لیے نازل کی ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنو]

اس آیت کے شروع میں احکامِ الٰہی کے کلی اصولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جبکہ آخری حصہ احکامِ جزئی کے بارے میں ہے۔ " بالحق " میں باء یا مصاحبت کے لیے ہے یا ملابست کے لیے۔ اگر مصاحبت کے لیے ہو تو آیت کے پہلے حصے کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے احکامِ کلی جب حضرت حق سے نازل ہوتے ہیں تو قلبِ رسولؐ تک پہنچنے تک مسلسل حق کی مصاحبت اور ہمراہی میں رہتے ہیں یعنی حق ان سے جدا ہوتا ہے نہ وہ احکام حق سے جدا ہوتے ہیں۔

پس کسی مرحلہ پر بھی شیطان ان تک نہیں پہنچ پاتا کہ ان میں کوئی کمی بیشی کر سکے۔ اگر "باء" ملابست کے لیے ہو تو اس کا معنی یہ ہو گا کہ آغازِ نزول سے لے کر آخر تک وحی لباسِ حق میں ہوتی ہے اس صورت میں بھی وحیٔ الٰہی ہر قسم کی کجی اور خرابی سے محفوظ و مامون ہوتی ہے۔

واضح ہے کہ وحی کے کلی اصولوں کے ساتھ تو معاشرے کا نظام نہیں چلتا بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں جزوی امور کی وضاحت ضروری ہوتی ہے لہٰذا اس کے بارے میں عمل کے حوالے سے ارشاد فرمایا گیا ہے:

"لتحکم بین الناس بما اراک اللہ"

یعنی رسول اللہؐ نے اللہ کے کلی احکام کو اجرا کرتے ہوئے جو بھی تشریح و توضیح بیان فرمائی یا جس سنت پر آنحضرتؐ نے عمل کیا ہے ایسا نہیں کہ اسے آپؐ نے اپنی یا معاشرے کی مرضی سے انجام دیا ہو بلکہ یہ سب کچھ حکمِ الٰہی ہی سے تھا یعنی جیسے ابراہیم خلیل اللہ کی خواہش پر "ارنا مناسکنا"[1] کی گواہی کے مطابق اللہ نے انہیں مناسکِ حج کی تعلیم دی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی قوانینِ الٰہی کی جزئیات سے آگاہ کیا اور فرمایا:

"لتحکم بین الناس بما اراک اللہ"

(تاکہ جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اس کے مطابق تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو)

اسی حقیقت کی طرف آیہ شریفہ "وما ینطق عن الھوی"[2] میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ "نطق" یہاں پر لکھنے یا عمل کے مقابلے میں نہیں ہے بلکہ یہ سیرتِ نبویؐ کے لیے کنایہ ہے اور اس میں رسول اللہؐ کا سکوت، گفتگو اور قیام و قعود سب شامل ہیں۔ اس آیت میں نطق مندرجہ ذیل آیت میں کلمہ "لفظ" کی مانند ہے۔

"مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ" (ق-۱۸)

---

[1] بقرہ-۱۲۸ [2] نجم-۳

کیونکہ یہ فرمانا کہ جو لفظ بھی انسان سے صادر ہوتا ہے فرشتہ اسے لکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے، اس معنی میں نہیں کہ وہ فرشتہ یا کوئی اور فرشتہ جو اُس کے دائیں یا بائیں نگرانی پر مامور ہے نقط الفاظ کو ریکارڈ کرتا ہے اور باقی ہر چیز کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جو چیز بھی اُس سے صادر ہوتی ہے ان دو نگران فرشتوں میں سے کہ جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں اُن میں سے ایک اُسے ریکارڈ کر لیتا ہے کیونکہ اس سے پہلے کی آیت ان فرشتوں کے متعدد ہونے کا ذکر یوں کرتی ہے:

"اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین و عن الشمال قعید"

(ق - ۱۷)

وسعتِ معنی کے لحاظ سے یہ آیت ذیل کی آیۂ کریمہ کی مانند ہے۔

"ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل" (بقرہ - ۱۸۸)

کیونکہ اس آیت کا معنی یہ نہیں کہ صرف دوسروں کا مال ناحق کھانا ہی اکلِ مال بالباطل ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ دوسرے کے مال میں ہر طرح کا تصرف باطل ہے چاہے وہ غصبی لباس پہننا ہو یا اسی طرح کا کوئی اور کام۔

گذشتہ بحث سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ نبیؐ کی حاکمیت حاکمیتِ الٰہی کے عرض یا طول میں نہیں بلکہ درحقیقت اللہ کی ہی حاکمیت کو پیش کیا جانا ہے توحید در حاکمیت کے اس مفہوم کو سورہ نساء کی آیت ۵۹ سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے:

"یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اُولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ و الرسول ان کنتم تؤمنون باللہ و الیوم الاٰخر ذلک خیر و احسن تأویلاً"

آیت کے شروع میں رجوع کرنے کے لیے تین مراجع کا ذکر ہے: اللہ، رسول اور اولی الامر اور جب یہ فرمایا کہ اگر تم میں اختلاف ہو جائے تو خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو تو یہاں پر دو مراجع کا ذکر ہے کیونکہ

اگر اولی الامر کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو پھر خود اولی الامر اس اختلاف کو حل نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جبکہ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اگر تم مبدأ و معاد پر ایمان رکھتے ہو تو ان احکام کی تعمیل کرو۔ یہاں توحید کا ذکر ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتقاد و اطاعت کا محور اللہ ہے لہٰذا اگر ساتھ ساتھ رسولؐ اور ائمہ علیہم السلام کا بھی ذکر ہو تو ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے عرض یا طول میں نہیں ہے بلکہ اللہ ہی کی اطاعت کا مظہر ہے اسی طرح ان کا حکم بھی حکمِ خدا کا مظہر ہے۔

والحمد للہ رب العالمین

○

درس ۱۷

برہانِ ششم:

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ سرپرستی اور تدبیر کے معنی میں ولایت کی بحث لفظی نہیں بلکہ معنوی اور روحانی ہے لہٰذا وہ آیات جو حق تعالےٰ کی حاکمیت و تدبیر پر دلالت کرتی ہیں بحثِ ولایت میں سند کے طور پر لائی جا سکتی ہیں۔ ولیٔ تشریع میں ہو یا تکوین میں مولیٰ علیہ کا مربی ہوتا ہے لہٰذا حق تعالےٰ کی ربوبیت و تدبیر کے بارے میں دلائل سے بھی بحثِ ولایت میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اب اللہ تعالےٰ کی ربوبیت کے بارے میں آیات سے استفادہ کرتے ہوئے ہم تین براہین پیش کرتے ہیں۔ یہ تینوں براہین اگرچہ نتیجے کے لحاظ سے یکساں ہیں لیکن ان کی حدِ وسط میں فرق ہے اس وقت ہمارے زیرِ بحث برہان اول ہے اس کی حدِ وسط اللہ تعالےٰ کی خالقیت ہے کیونکہ پرورش دو دلیلوں کی بنیاد پر تخلیق و آفرینش کی طرف لوٹ جاتی ہے پہلی دلیل یہ ہے کہ پرورش عینِ خلقت ہے کیونکہ پرورش کرنے کا معنی ہے کہ استعداد عطا کرنے والے اور جس کو استعداد عطا کی جا رہی ہے کے درمیان تعلق برقرار کیا جائے یعنی قابلیت عطا کرنے والے اور جسے قابلیت عطا کی جا رہی ہے ان کے درمیان رابطہ قائم کیا جائے دوسرے لفظوں میں طلبِ کمال کرنے والے کو کمال عطا کیا جائے لہٰذا پرورش و ربوبیت کی حقیقت ایجاد و خلقت کے سوا کچھ نہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ پرورش و خلقت لازم و ملزوم ہیں کیونکہ کسی چیز کو وہی پروان چڑھا سکتا ہے کہ جو اس کا خالق ہو اس کی وضاحت یہ ہے کہ خالق مخلوق کی درونی و بیرونی خصوصیات سے آگاہ ہے نیز جس مقصد کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے اسے اس مقصد تک پہنچانے والی راہ کی خصوصیات سے بھی واقف ہے۔

قرآنِ کریم ان دو دلیلوں کی بنیاد پر مشرکین سے فرماتا ہے :

"الا لہ الخلق والأمر" (اعراف - ۵۴)

جنہوں نے اللہ کے خالق ہونے کو قبول کر لیا ہے انھیں چاہیئے کہ اس کی ربوبیت کو بھی قبول کریں کیونکہ اس آیۂ کریمہ میں "لہ" کہ جو مقدم ہے حصر کا فائدہ دیتا ہے اور امر سے مراد اس آیت میں فرمانروائی اور تدبیر ہے اسی طرح سورۂ یٰسین کی مندرجہ ذیل آیت میں اشیاء کے ملکوتی پہلو کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :

"انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون"

دونوں صورتوں میں آیت خلقت کو بھی اللہ تعالےٰ سے مختص قرار دیتی ہے اور امر کو بھی۔

سورۂ انعام کی آیت ۱۰۲ میں بھی اللہ تعالےٰ کی ربوبیت اور خالقیت کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔

علاوہ ازیں باہم منسلک مقدمات پر مشتمل قیاس کی بنیاد پر اللہ کی عبودیت و اطاعت کے لازم و ملزوم ہونے کا نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

"ذٰلکم اللہ ربکم لا الٰہ الا ھو خالق کل شیٔ فاعبدوہ"

آیت کا پہلا حصہ کہ جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تمہارا خالق و رب ہے صغرائے قیاس ہے اور اس سے منسلک کبریٰ یہ ہے کہ ربّ کی عبادت کرنا چاہیئے اور اس قیاس سے اخذ ہونے والا نتیجہ یہ ہے کہ عبودیتِ خدا ضروری ہے لہٰذا فرمایا گیا ہے "فاعبدوہ"۔

یہ قیاس کہ جس کے بعض مقدمات باہم ایک دوسرے سے منسلک ہیں بعض دیگر آیات میں کسی اور شکل میں بیان کیا گیا ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۵۱ میں ارشاد ہوتا ہے :

"ان اللہ ربی و ربکم فاعبدوہ"

صغریٰ قیاس یہ ہے کہ اللہ میرا اور تمہارا رب ہے اور اس کے ساتھ ہی منسلک

کبریٰ رب کی عبادت کا لازمی ہونا ہے جبکہ اس سے ماخوذ نتیجہ عبودیتِ حق کا وجوب ہے:

برہانِ ہفتم:

یہ بھی گذشتہ برہان کی طرح اللہ تبارک وتعالےٰ کی ربوبیت پر برہان ہے۔ گذشتہ برہان کی حدِ وسط اللہ تعالےٰ کی خالقیت تھی جبکہ اس کی حدِ وسط یہ ہے کہ قانون اور شریعت بنانے والے کو وجودِ انسان کے غیب سے باخبر ہونا چاہیئے کیونکہ مقنن کے لیئے ضروری ہے کہ جو قانون وہ بناتا ہے اس کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی حدود سے آگاہ ہو انسانی تربیت کے لیے درکار بیشتر قوانین کا تعلق اس کے وجود کے غیب سے ہے کیونکہ انسان ایک طرف تو جسمِ مادی اور روحِ مجرد سے مرکب ہے اور دوسری طرف اس کے بیشتر کاموں کا تعلق عقاید و اخلاق، فضائلِ نفسانی او امورِ روحانی سے ہے۔

سورۂ مبارکہ بقرہ کی آیت ۲۸۴ میں قرآنِ کریم اس برہان کے بارے میں فرماتا ہے:

«للہ ما فی السمٰوات و ما فی الارض و ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ فیغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء واللہ علیٰ کل شیٴ قدیر»

یعنی جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے اور جو کچھ تمہارے نفوس کے اندر ہے چاہے اس کا اظہار کرو چاہے اسے چھپالو، سب حق تعالےٰ کے سامنے ہے اور وہ اس کا حساب لے گا ......

یہ جو آیت کے شروع میں فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کا ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ جو کچھ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو سب کچھ خدا جانتا ہے اور اس کا حساب لے گا ظاہراً روح و بدن کی آسمان وزمین کے

ساتھ تشبیہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس طرح آسمان سے زمین پر نور و حرارت نازل ہوتے ہیں اسی طرح روحِ مومن سے اس کے بدن پر خیر و برکت کا نزول ہوتا ہے۔

اگر صرف خدا انسان کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تو پھر فقط وہی ہے کہ جو انسان سے حساب و کتاب لے سکتا ہے اور پوچھ گچھ کر سکتا ہے اور اگر صرف وہی حساب لے سکتا ہے تو پھر وہی انسان کی پرورش کے لیے قانون بنا سکتا ہے لہٰذا ولایتِ تشریعی اللہ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہ ہو گی جبکہ تکوین کے پہلو سے بھی صرف وہی جزا یا سزا دے سکتا ہے۔

"فیغفر لمن یشاء و یعذّب من یشاء و اللہ علیٰ کلّ شیٔ قدیر"

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۵ میں بھی اس برہان کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی حد وسط حق تعالےٰ کی انسان کے اندرونی اسرار سے آگاہی ہے ارشاد ہوتا ہے:

واعلموا انّ اللہ یعلم ما فی انفسکم فاحذروہ"

جان لو کہ اللہ تمہارے نفوس سے آگاہ ہے پس اس کی نافرمانی سے خبردار رہو۔

برہانِ ہشتم:

گذشتہ دو براہین سے اس برہان کا فرق حد وسط کے اعتبار سے ہے اس برہان کی حدِ وسط معادِ انسان ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان کی حیاتِ جاوید کا آغاز چونکہ موت سے ہوتا ہے لہٰذا انسان بے مقصد نہیں ہو سکتا اور چونکہ وجودِ انسانی کا کوئی مقصد اور ہدف ہے اس لیے یقیناً اس ہدف تک پہنچنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ موجود ہے اور وہ راستہ جو انسان کو اس ہدف تک پہنچاتا ہے دین ہے جسے صراطِ مستقیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دین چونکہ ایسے قوانین کے مجموعے کا نام ہے

جو اس ہدف سے ہم آہنگ ہے لہٰذا دین کا بنانے والا وہی ہو سکتا ہے جو اس ہدف یعنی معاد انسان سے آگاہ ہو اور وہ فقط خدا ہے جو معاد سے آگاہ ہے۔

اس بارے میں کہ انجام انسان سے فقط اللہ تعالےٰ آگاہ ہے بہت سارے عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں بلکہ یہ امر اس قدر واضح و آشکار ہے کہ محتاج ذکر نہیں۔ معاد اور اپنے انجام کے بارے میں انسان کی جہالت اس امر کا باعث بنی کہ اللہ تعالےٰ نے "وما ارسلناك الا كافة للناس"[1] کے مصداق، تمام انسانوں کے لیئے آنے والے رسولؐ کے بارے میں فرمایا:

"كما ارسلنا فيكم رسولاً منكم يتلوا عليكم اٰياتنا ويزكيكم ويعلمكم الكتاب والحكمة ويعلمكم مالم تكونوا تعلمون" (بقرہ - ۱۵۱)

یعنی ہم نے رسولؐ کو بھیجا تاکہ وہ تم انسانوں کو ایسی چیزیں سکھائے جن کا سیکھنا تمہارے لیے ہرگز ممکن نہ تھا کیونکہ انسانی علوم جس قدر بھی ترقی کر جائیں عالم طبیعت کی حدود کے اندر ہی رہیں گے جبکہ معاد کا علم اور اشیاء کی حقیقت کا ایسا علم کہ جیسا برزخ اور قیامت میں واضح و آشکار ہوگا انسانی علم اور تجربے کی بساط سے باہر ہے۔ ان علوم کے حصول کا واحد ذریعہ شہود و غیب ہے جو اللہ کی طرف سے وحی و الہام کے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر علم انسانی کی پیشرفت سے انسان حرمتِ غیبت کو قرآن کی طرح مردار کھانے کی مثل کیسے بیان کر سکتا ہے اور کیسے کہہ سکتا ہے:

"لا يغتب بعضكم بعضاً أيحب احدكم ان يأكل لحم اخيه ميتاً"

(حجرات - ۱۲)

---

[1] سبا - ۲۸

غیبت کرنے والے انسان کے اندر مردار کھانے والے کے آثار کو پانا ہرگز علومِ انسانی سے مربوط نہیں کہ جسے علم کی ترقی سے سمجھا جا سکے۔

برزخی مسائل اور مراحلِ قیامت کے شہود ہی سے اس بات کا علم ہو سکتا ہے لہٰذا انسان خود سے اشیاء کو اس طرح سے نہیں سمجھ سکتا کہ ان کی حلیت اور حرمت کے بارے میں رائے دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً" (جمعہ۔۲)

یعنی اگر معاشرے سے نبی کو نکال لیا جائے تو سب نابغہ و فرزانۂ روزگار شخصیات ان امور کے بارے میں امی اور جاہل ہیں جن کے ابلاغ کے لیے نبی کو مامور کیا گیا ہے بلکہ یہ امر انسانی معاشرے میں منحصر نہیں بلکہ فرشتوں کو بھی اگر علومِ الٰہی سے آگاہ انسانِ کامل تعلیم نہ دے تو وہ بھی جاہل اور ناآگاہ ہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"یا آدم انبئھم باسمائھم" (بقرہ۔۳۳)

نیز فرمایا:

"وعلم آدم الاسماء کلھا" (بقرہ۔۳۱)

بنابریں خدا اور علومِ الٰہی سے آگاہ شخص کے سوا کوئی بھی انسان کی تدبیر و پرورش پر قادر نہیں کیونکہ اس کے علاوہ کوئی بھی انسان کے اسرار اور اس کی عاقبت و انجام سے آگاہ نہیں اور چونکہ وہی انسان کی تدبیر کرنے والا اور اس کے امور کو چلانے والا ہے لہٰذا وہی قابلِ پرستش معبود ہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"ان اللہ ربی وربکم فاعبدوہ ھٰذا صراط مستقیم"

(آل عمران۔۵۱)

یہ برہان اور دیگر براہین جو اللہ تعالےٰ کی ربوبیت پر دلالت کرتے ہیں بھی یہ امر ثابت کرتے ہیں کہ وہ انسان کی تدبیر اور تربیت کے لیے نظام بنانے کی اہلیت رکھتا ہے ان سے اہلِ عقل و خرد پر یہ بات اس طرح واضح و آشکار ہوتی ہے کہ

ان کے لئے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ وہی ہے جو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے!

"ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک هو الحق ویهدی الی صراط العزیز الحمید"

(سبا - ۶)

جو اہل خرد جانتا ہے کہ جو کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نازل ہوا ہے حق ہے، اس طرح سے کہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے ضلالت وگمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ کچھ اور تعبیرات بھی ہیں جن سے یہی مفہوم بخوبی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً:

"قل ان الهدی هدی الله" (آل عمران - ۷۳)

(کہہ دے کہ ہدایت تو وہی ہے جو خدا کی طرف سے ہو۔)

یا یہ آیۂ کریمہ:

"ان هدی الله هو الهدی" (بقرہ - ۱۲۰)

(بیشک ہدایت الٰہی ہی ہدایت ہے)

ہدایت چونکہ ہدایت الٰہی میں منحصر ہے لہٰذا اس کی ہدایت کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں۔

"فماذا بعد الحق الا الضلال" (یونس - ۳۲)

لہٰذا اگر کوئی شخص کسی چیز کو وحی پر انحصار کیے بغیر حلال یا حرام قرار دے تو قرآن اسے مفتری قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

"قل ءالله اذن لکم ام علی الله تفترون" (یونس-۵۹)

کیا اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم اس پر افترا باندھتے ہو؟ نیز فرماتا ہے۔

"ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب هٰذا حلال وهٰذا حرام لتفتروا علی الله الکذب" (نحل - ۱۱۶)

اللہ پر یہ افترا کہ جس کی نسبت مشرکوں کی طرف دی گئی ہے اس جہت سے نہیں کہ انہیں دعوائے نبوت تھا بلکہ اس جہت سے ہے کہ جو کام اللہ سے مختص ہے وہ اس کی نسبت غیر کی طرف دیتے تھے۔

دوگانہ پرستوں کی طرف افتراء کی نسبت شرک کی نسبت کی مانند ہے کیونکہ ایسا نہ تھا کہ وہ عبودیت خدا میں شریک کے قائل تھے اور کچھ عبادت غیر اللہ کیلئے انجام دیتے تھے عبادت میں وہ ان لوگوں کی طرح نہ تھے جو کچھ عبادت اللہ کے لیے اور کچھ غیر اللہ کے لئے انجام دیتے تھے اور نہ ہی ان کی طرح تھے جو اپنا عمل غیر مخلصانہ اور ریاکارانہ انجام دیتے تھے بلکہ وہ اپنا تمام تر عمل بتوں کے لیے بجا لاتے تھے اور یہ جو اللہ نے انہیں مشرک کہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عبادت بالذات اور بالاصالہ اللہ کے لئے ہے وہ کسی اور چیز کو مستحق بالاصالہ سمجھ کر "وثن" کے نام پر اس کی عبادت بجالاتے تھے اور اسے خدا کے مقابل فرض کرتے تھے۔

افتراء کے بارے میں بھی بات ایسی ہی ہے وہ کبھی بھی ادعائے نبوت کے ساتھ ایک حکم کی خدا کی طرف جھوٹی نسبت نہیں دیتے تھے بلکہ وہ اللہ کی خالقیت اور اس کی تکوینی لحاظ سے ولایت و سرپرستی پر ایمان رکھتے تھے۔ پھر بھی اس بہانے سے کہ اس تک رسائی نہیں ہو سکتی قوانین سازی کی نسبت غیر خدا کی طرف دیتے تھے جبکہ یہ امر خدا تعالے سے مختص ہے۔

قرآن کی منطق کے مطابق قانون سازی کا اختیار فقط خدا کو ہے لہٰذا اگر کوئی فکر انسانی کے ذریعے انسانی ضروریات کو پورا کرنا چاہے تو اس نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے یعنی جو کام اللہ سے مختص ہے اس نے خدا سے اس کام کی نفی کی ہے اور اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف دی ہے۔ سورۂ حم السجدہ کی آیت ۹ میں قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

"قل ءانکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ انداداً ذلک رب العالمین"

کہہ دیجئے کیا تم اس سے کفر کرتے ہو کہ جس نے زمین کو دو مرحلوں میں خلق کیا اور تم اس کا ہمسر قرار دیتے ہو وہ تو عالمین کا پروردگار ہے۔

دوگانہ پرستوں نے جو بتوں کو خدا کا ہمسر قرار دے رکھا تھا اس لحاظ سے نہ تھا کہ وہ کبھی بتوں کی اطاعت کرتے تھے اور کبھی اللہ کی کیونکہ وہ تو بتوں کے علاوہ کسی کی پرستش نہیں کرتے تھے اور وہ مختلف خداؤں اور جزئی اربابِ نوع سے مربوط قوانین کے علاوہ کسی اور قانون کی پیروی نہ کرتے تھے بلکہ خدا کا ہمسر بنانا اس جہت سے تھا کہ جو عمل خدا سے مختص تھا اس کی غیرِ خدا کی طرف نسبت دیتے تھے اور یہ دراصل اس خدا کے لیے ہمسر قرار دینا ہے کہ جو "لیس کمثلہ شیٔ" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن مشرکین اعتراف کریں گے:

" تاللہ ان کنّا لفی ضلال مبین، اذ نسوّیکم بربّ العالمین"

(شعرا - ۹۷)

یعنی ہم کھلی گمراہی میں تھے کہ ہم نے تمہیں رب العالمین کے مساوی سمجھا اور جو کچھ اس سے مختص تھا اس کی تم سے توقع رکھی۔

البتہ توجہ رہے کہ شروع شروع میں بت پرست ان بے روح پیکروں کی عزت وتکریم جزئی خداؤں اور اربابِ نوع کی یاد میں کرتے تھے لیکن بعد کے جاہل دوگانہ پرست خود ان کا الگ سے احترام کرنے لگے۔

یہاں تک ہم نے جو دلائل پیش کئے وہ تکوین یا تشریع میں سرپرستی کے معنی میں ولایت کی غیرِ خدا سے نفی کرتے تھے اور اسے اللہ میں منحصر سمجھتے تھے یہ دلائل بلا واسطہ بھی تھے اور حکومت، ربوبیت اور ہدایت سے مربوط آیات سے بھی۔ اب ہم اس سلسلے کو یہیں پر ختم کرتے ہیں۔

والحمدللہ ربّ العالمین

درس ۱۸

ولایتِ عامّہ و ولایتِ خاصّہ

یہ امر بیان کرنے کے بعد کہ ہر طرح کی ولایت، چاہے وہ تکوینی ہو یا تشریعی اللہ سے مختص ہے، یہ جاننا ضروری ہے کہ ولایتِ تشریعی اور ولایتِ تکوینی میں کیا فرق ہے۔

اللہ تعالےٰ کی ولایتِ تکوینی مومن اور کافر کے لیے یکساں ہے یعنی کوئی بھی بالغ و عاقل شخص ایسا نہیں جو اللہ کی ولایتِ تشریعی سے باہر ہو کیونکہ اہلِ ایمان کی طرح کفار پر بھی ضروری ہے کہ وہ اصولِ دین پر اعتقاد رکھیں اور فروعِ دین پر عمل کریں۔

تاہم اللہ تعالےٰ کی ولایتِ تکوینی دو طرح کی ہے۔ (۱) ولایتِ عامّہ (۲) ولایتِ خاصّہ۔ ولایتِ عامّہ ولایتِ تشریعی کی طرح مومنوں اور کافروں دونوں پر محیط ہے۔ لیکن ولایتِ خاصّہ صرف مومنین سے مختص ہے کیونکہ یہ ولایتِ تشریعی کی بنیاد پر راستہ طے کرنے کی توفیق سے عبارت ہے۔

تکالیفِ شرعی کو بجالانے کا شوق اور اس کی طرف کشش ایک امرِ وجودی ہے جس کا خود اپنا ایک سبب ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو اس سبب کے ساتھ ارتباط سے محروم ہوں انھیں ہرگز اس کی توفیق نہیں ہوتی۔ بعض آیات میں اسی محرومیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اولٰئک الذین لم یرد اللہ ان یطھّر قلوبھم"

(مائدہ - ۴۱)

یعنی خدا نے ان کے قلوب کو پاک کرنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ یقیناً اس سے مراد ارادۂ تشریعی نہیں کیونکہ شرعی لحاظ سے طہارت سب کی ذمہ داری ہے۔ پس یہاں مراد ارادۂ تکوینی ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے:

«ساصرف عن ایاتی الّذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق» (اعراف ۱۴۶)

یعنی جب تدوینی اور تکوینی آیات بار باران کی آنکھوں کے سامنے قرار دی جائیں اور وہ بے اعتنائی اور غفلت کی حالت میں غرور وتکبر کے ساتھ ان کے پاس سے گزر جائیں اور کفر کریں تو:

«وکاین من ایۃ فی السّمٰوات والارض یمرّون علیھا وھم عنھا معرضون» (یوسف - ۱۰۵)

ہم آیات میں تفکر و تدبر کی توفیق انھیں نہیں دیں گے، اس طرح کہ وہ مطالعہ کی لذت اور اسرارِ عالم میں تامل و تفکر کی حلاوت کا ادراک نہیں کریں گے حالانکہ وہ پہلے کی طرح ولایتِ تشریعی کے ماتحت ہی ہیں اور نتیجتاً تکالیفِ الٰہی کی بجاآوری ان کی ذمہ داری ہے۔

«فاللہ ھو الولیّ» (شوریٰ - ۹)

یہ آیۂ کریمہ خدا کی ولایتِ عامہ اور مطلقہ پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن جہاں طاغوت اور شیطان کی کفار پر ولایت کے بالمقابل مومنین ومتقین پر ولایتِ الٰہی کا ذکر ہوا ہے وہاں مراد ولایتِ خاصہ ہے، جیساکہ آیت الکرسی میں ہے:

«اللہ ولیّ الّذین امنوا یخرجھم من الظلمات الی النّور والّذین کفروا اولیاؤھم الطاغوت یخرجونھم من النّور الی الظلمات» (بقرہ - ۲۵۷)

(اللہ ایمان لانے والوں کا ولی اور حامی ومددگار ہے اور وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں انکے حامی ومددگار طاغوت ہیں اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔)

- یا جیساکہ سورہ جاثیہ کی آیت ۱۹ میں ہے:-

"انھم لن یغنوا عنک من اللہ شیئا وان الظالمین بعضھم اولیاء بعض واللہ ولی المتقین"

(اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔)

ولایتِ خاصہ کی طرف دیگر جن آیات میں اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک سورۂ نحل کی آیت ۶۳ ہے:

"تاللہ لقد ارسلنا الی امم من قبلک فزین لھم الشیطان اعمالھم فھو ولیھم الیوم و لھم عذاب الیم"

یعنی جب لوگوں کے لیے پیغمبر بھیجے گئے اور انھیں ولایتِ تشریعی کے ذریعے حق تعالےٰ کی طرف بلایا گیا شیطان نے ان کے افکار میں تصرف کرکے دنیا کو ان کے لیے خوبصورت بنا کر پیش کیا اور انھوں نے دنیا کو زینت خیال کیا اور اب شیطان ان کا ولی ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت کی ولایتِ خاصۂ الٰہی پر دلالت اس جہت سے ہے کہ ولایتِ خاصہ کے بالمقابل ولایتِ شیطان کے ماتحت وہ لوگ قرار پاتے ہیں جو ولایتِ خاصہ کے زیرِ سایہ موجود اہلِ ایمان کے مسلک سے خارج ہو جائیں۔ سورۂ اعراف کی آیت ۲۷ میں اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"یا بنی آدم لا یفتننکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنۃ ینزع عنھما لباسھما لیریھما سوآتھما انہ یراکم ھو وقبیلہ من حیث لا ترونھم انا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون"

شیاطین ایسے لوگوں کے ولی و سرپرست ہیں جو اہلِ ایمان نہیں۔ البتہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے غیر مومن کا ولی شیطان کو قرار دینے سے پہلے خداوندِ عالم عقل و

وحی کے ذریعے ان پر حجت تمام کر چکا ہوتا ہے۔

سورۂ حدید کی آیات ۱۴ اور ۱۵ میں جہاں آگ کی کفار پر ولایت کا ذکر ہوا ہے خداوندِ عالم فرماتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مومنوں کے ساتھ ہمنشینی کے باوجود اپنے آپ کو فتنے اور ہلاکت میں ڈالا ہے اور آرزوؤں اور دنیاوی خیالات میں مبتلا ہیں۔

"ینادونھم الم نکن معکم قالوا بلیٰ ولکنکم فتنتم انفسکم وتربصتم وارتبتم وغرتکم الامانی حتیٰ جاء امر اللہ وغرکم باللہ الغرور، فالیوم لا یؤخذ منکم فدیۃ ولا من الذین کفروا مأوٰکم النار ھی مولٰکم وبئس المصیر"

مذکورہ آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آتشِ قیامت آتشِ دنیا کی طرح ایک غیر مُدرِک اور لاشعور سی چیز نہیں بلکہ یہ ایسی آگ ہے جو شعور و ادراک کے ساتھ کفار پر ولایت رکھتی ہے۔

بعض دیگر آیات کا ظاہر بھی اسی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ ان آیات میں سے ایک سورۂ فرقان کی آیت ۱۲ ہے:

"اذا رأتھم من مکان بعید سمعوا لھا تغیظًا وزفیرًا"

یعنی جب آتشِ جہنم انھیں دور سے دیکھے گی تو وہ (جہنمی) اس کی غصے بھری غراہٹ دور سے سنیں گے۔

جب آیاتِ قرآن کے ظواہر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آتشِ جہنم دنیاوی آگ کی مانند نہیں کہ جس کے لیئے نیک اور بد یکساں ہوں بلکہ یہ ایسی آگ ہے جو دیکھتی بھی ہے اور پہچانتی بھی ہے اور پھر اپنے ارادے کے ساتھ کفار کو کھینچ لیتی ہے اور انہیں اپنی ولایت کے ماتحت قرار دیتی ہے تو کوئی دلیل نہیں کہ ہم ان آیات کے ظواہر کو نظر انداز کر دیں اور انہیں مجاز پر محمول کریں۔

بعض اوقات ولایتِ خاصۂ الٰہی کی بلا واسطہ خدا کی طرف نسبت دی جاتی ہے، جیسے درج ذیل آیات میں:

"اللہ ولی الذین اٰمنوا"

"واللہ ولی المتقین"

اور بعض اوقات واسطے کے ساتھ نسبت دی جاتی ہے، جیسے ذیل کی یہ آیت:

"انّ الّذین قالوا ربّنا اللہ ثمّ استقاموا تتنزّل علیھم الملائکۃ ألّا تخافوا ولا تحزنوا" (حٰم السجدہ - ۳۰)

کیونکہ باستقامت اور باعزم مومنین خداوندِ عالم کا فیضِ خاص مخصوص فرشتوں کے ذریعے وصول کرتے ہیں۔

ولایت میں تفویض کی نفی:

غیرِ خدا سے سلبِ ولایت کے باب میں جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں ولایتِ تشریعی یا ولایتِ عامّہ یا خاصّہ کو واسطوں کی طرف نسبت دی گئی ہے، جیسے خدا فرماتا ہے:

"انّما ولیّکم اللہ ورسولہ والّذین اٰمنوا الّذین یقیمون الصّلٰوۃ ویؤتون الزّکٰوۃ وھم راکعون" (مائدہ - ۵۵)

یا جہاں ولایت کو آتش، شیطان یا طاغوت سے نسبت دی گئی ہے، ان تمام موارد میں مراد ولایتِ الٰہی کے مظاہر کا بیان ہے۔ البتہ ان میں سے بعض حضرتِ حق کے اسمائے جمالیہ کے مظہر ہیں، مثلاً جہاں ولایت لطف و ہدایت کا مظہر ہے جبکہ بعض دیگر خداوندِ عالم کے اسمائے جلالیہ کے مظہر ہیں، مثلاً جہاں ولایت قہر و غضبِ خدا کا مظہر ہے۔

اس لحاظ سے یہ پتا چلتا ہے کہ تشریع یا تکوین کے کسی مورد میں بھی غیرِ خدا کے لئے ولایت بطور تفویض ثابت نہیں۔

تفویض کے محال ہونے پر دو عقلی براہین پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے

پہلے برہان میں حد وسط ممکنات کا فقرِ ذاتی تھا کیونکہ اگر کوئی موجود، چاہے وہ انسان ہو یا غیر انسان کسی کام کو استقلال کے ساتھ انجام دے تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ کام بجالاتے وقت وہ موجود قائم بالذات ہو جبکہ ممکنات ہمیشہ حدوث اور بقاء دونوں میں غیر کی محتاج ہیں۔

برہانِ دوم میں حدِ وسط خدا کا لا محدود ہونا تھا کیونکہ اگر خدا لا محدود ہے تو اس کی ربوبیت اور نتیجتاً اس کی ولایت بھی محدود اور قابلِ تقطیع نہ ہوگی جبکہ تفویض فیض رساں کی ولایت کی محدودیت اور تقطیع کے برابر ہے۔

یہ دو عقلی براہین عقلی ہونے کے لحاظ سے قابلِ تخصیص نہیں ہیں یعنی ان میں استثناء نہیں ہو سکتا لہٰذا تفویض کے بارے میں جو کچھ کافی شریف کی بعض روایات میں آیا ہے اس سے مراد اصطلاحی تفویض نہیں بلکہ مراد درحقیقت مظہریت یا ایک طرح کی وکالت ہی ہے۔

وکالت اور ولایت میں فرق یہ ہے کہ موضوعِ ولایت میں اصل ولی ہے اور مولیٰ علیہ (زیرِ ولایت) ولایتِ ولی کے زیرِ سرپرستی ہوتا ہے جبکہ موضوع وکالت میں اصل وکیل نہیں بلکہ موکل ہے۔ وہ کام جو موکل بلا واسطہ انجام نہیں دینا چاہتا اسے اپنے وکیل کے ذریعے انجام دیتا ہے۔

البتہ بعض مقاماتِ کمال میں کہ جو توکل کے نام سے ہیں توکل کی نسبت غیرِ خدا کی طرف دی گئی ہے، اس طرح کہ خداوندِ عالم وکیل قرار پاتا ہے اور غیرِ خدا اس کا موکل ہوتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے ان موارد میں بھی وکالت کی بازگشت ولایت ہی کی طرف ہے کیونکہ بندہ پروردگار کی طرف توجہ رکھتا ہے یعنی وہ قبولِ ولایت کرتا ہے نہ کہ وکالت رکھتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالےٰ نے بعض قرآنی تعبیروں میں اپنے اولیاء کو وکلا کے نام سے یاد کیا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۸۹ میں فرماتا ہے:

"فان یکفر بھا ھٰؤلاء فقد وکلنا بھا قوماً لیسوا بھا

بکافرین "

یعنی اگر برے لوگ آیاتِ الٰہی سے کفر اختیار کریں تو خداوندِ عالم انبیاء اور اولیاء کو کہ جو اس کے دین میں وکلاء ہیں ان کی طرف بھیجتا ہے۔

لہٰذا دین میں وکالت اگرچہ ممکن ہے لیکن تفویض اپنے اصطلاحی معنی میں ممتنع اور ناممکن ہے وہ ولایت جس کی تشریع میں انبیاء کی طرف نسبت دی جاتی ہے بعض موارد میں آیاتِ الٰہی کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے اور بعض دیگر موارد میں تحریفات اور خلاف ورزیوں کے مقابلے میں احکامِ الٰہی کی حفاظت و سرپرستی کا نام ہے۔ انبیاء کے متولی ہونے کا معنی یہ ہے کہ احکامِ الٰہی اجراہوں اور متجاوز کے مقابلے میں حدود و احکامِ الٰہی کا دفاع ہو۔

امورِ الٰہی کی تشریح میں نبی کی دو ذمہ داریاں ہیں ان میں ایک خود آیات کی تلاوت ہے جو کتابِ الٰہی کی صورت میں اس پر نازل ہوتی ہیں، اور دوسری ان کلیات کی تفسیر و توضیح ہے جو قرآن میں ذکر ہوئی ہیں۔ سورۂ نحل کی آیت ۴۴ میں اس بارے میں آیا ہے:

" وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون "

تفسیر و توضیح کا یہ حق بھی کہ جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا گیا ہے ہرگز تفویض کے معنی میں نہیں کیونکہ اس بارے میں آنحضرتؐ جو کچھ بھی فرماتے تھے وہ سب خدا کی طرف سے الہام تھا کہ جو حدیثِ قدسی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مثال کے طور پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے " والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما " یا " اٰتوا الزکوٰۃ " کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے ہاتھ کاٹنے کی حد یا زکوٰۃ کے موارد کو بیان فرمایا تو ہرگز ایسا نہ تھا کہ خود وجوبِ زکوٰۃ اور ہاتھ کاٹنے کو تو خداوندِ عالم نے بیان فرمایا ہو جبکہ ہاتھ کاٹنے کی مقدار یا زکوٰۃ کے موارد کو معاذاللہ رسول اللہؐ نے اپنی نظر کے مطابق متعین فرمایا ہو۔ رسول اکرمؐ جو کچھ بھی

تفسیر آیہ میں بیان فرمایا کرتے تھے ذیل کی آیت ان سب پر دلالت کرتی ہے۔

"وما ینطق عن الھوٰی، ان ھو الا وحی یوحیٰ"

(نجم-۳، ۴)

(وہ اپنی نفسانی خواہش سے تو کچھ بولتے ہی نہیں یہ صرف وحی ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے۔)

اس لحاظ سے جو کچھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معراج پر "فرض اللہ" اور "فرض النبی" کے عنوان سے سمجھا اس معنیٰ میں ہرگز نہ تھا کہ انہوں نے نماز میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کیا ہو بلکہ اس معنی میں ہے کہ آخری دو رکعت کو بھی الہامِ الٰہی کی مدد سے بیان فرمایا اور یہی وجہ ہے کہ تفسیر و تشریح پیغمبرؐ خداوندِ عالم سے منسوب ہے۔ سورۂ حشر کی آیت ۷ میں فرمایا گیا ہے:

"وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا و اتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب"

(جو کچھ رسولؐ تمہیں دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس سے منع کریں باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔)

یہ آیت مسائلِ تشریع کے بارے میں ہے نہ کہ قرآن کے تصورِ کائنات کے بارے میں کیونکہ آیت کا معنیٰ خصوصاً اس کے پہلے حصے یعنی "ما اٰتیکم الرسول فخذوہ" کا ظاہری مفہوم دوسرے حصے یعنی "وما نھٰکم عنہ فانتھوا" کے قرینے کے ساتھ یہ بنتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرو۔ یہ آیت رسول اکرمؐ کے لیئے حقِ تفسیر و توضیح کو ثابت کرتی ہے اس کے علاوہ احکام و حدود کی تعلیم نیز حقِ سرپرستی اور اجرائے احکام بھی آنحضرتؐ کے لیے اثبات کرتی ہے آیہ "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔

کیونکہ یہ جو اللہ تعالے نے فرمایا ہے کہ پیغمبرؐ کے اوامر و نواہی کی اطاعت کریں اس سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ جہاں احکام و حدود کے مفسر و مبیّن ہیں وہاں ان کے اجرا کے لیے والی اور مسئول بھی ہیں۔ ورنہ اگر پیغمبرؐ صرف معلم و مفسر قرآن ہوتے تو ہرگز امر و نہی نہ کرتے بلکہ فقط اوامر و نواہی کی تعلیم دیتے۔

اصطلاحی تفویض کی نفی پر عقلی اور نقلی براہین کے علاوہ خود اُن روایات میں بھی کہ جن میں انبیاء کو تفویضِ ولایت کا ذکر ہے، بہت سے شواہد موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ روایات میں تفویض سے مراد تفویضِ اصطلاحی نہیں کہ جو استقلال پر دلالت کرتی ہے۔

اس طرح کی روایات اصولِ کافی میں کتاب الحجۃ باب "التفویض الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ والی الائمۃ علیہم السلام فی امر الدین" میں موجود ہیں۔ امام جعفر صادقؑ اور دیگر آئمہ علیہم السلام سے کچھ اس طرح کی عبارات وارد ہوئی ہیں:

"انّ اللہ عزّ وجلّ ادّب نبیّہ فاحسن ادبہ فلمّا اکمل لہ الادب قال انّک لعلی خلق عظیم ثمّ فوّض الیہ امر الدّین والامّۃ لیسوس عبادہ فقال عزّ وجلّ "وما آتٰکم الرّسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا" وانّ رسول اللہ کان مسدّدًا موفّقًا مؤیّدًا بروح القدس لا یزلّ ولا یخطئ فی شئ ممّا یسوس بہ الخلق فتأدّب بآداب اللہ"

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا اس روایت میں تاکید کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے پیغمبر اکرمؐ کی تربیت کو اپنے ذمہ لیا تھا یہاں تک کہ آنحضرتؐ آداب الٰہی اور خلقِ عظیم سے آراستہ ہوگئے اس کے بعد ہی امرِ دین آنحضرتؐ کو تفویض کیا گیا تاکہ آپؐ لوگوں کی الٰہی طریقے سے تربیت کریں۔ اس کے بعد بندوں کو بھی حکم دیا کہ:

"وما اٰتٰکم الرّسول فخذ وہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا"
(جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لیا کرو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہا کرو۔)

پس روایات میں تفویض تربیت کے معنی میں ہے کہ جو اصطلاحی تفویض سے مختلف ہے کیونکہ اصطلاح میں تفویض سے مراد ہے استقلال کے ساتھ کسی کو کام واگذار کرنا تفسیر قانون میں یا اجرائے قانون میں یا قوانین سے نکلنے والے فروعی اور غیر ثابت ضوابط کا استقلال کے ساتھ تعین کرنا اور ان کا اجرا کرنا جبکہ اصطلاح میں کلّی اصول کو قانون اور قوانین سے نکلنے والے متغیر فروعی جزئیات کو ضوابط کہتے ہیں۔

والحمد للہ ربّ العالمین

○

درس ۱۹

انبیاء کے علاوہ دیگر اولیائے الٰہی کیلئے ولایتِ تکوینی کا اثبات

یہاں تک ہم نے ولایت کی مختلف انواع، ولایتِ الٰہی کا حصر اور اس کی مختلف مظاہر میں تجلی کے بارے میں بات کی۔ اس کے علاوہ ولایتِ انبیاء کی تشریح اور انہیں تفویضِ ولایت کی نفی جیسے عناوین بھی زیرِ بحث رہے۔ اب ہم اس سوال کا جائزہ لیں گے کہ آیا انبیاء کے علاوہ بھی کسی کے لئے ولایت ثابت ہے یا نہیں۔

ظاہرِ قرآن یہ کہتا ہے کہ قانون اور اس کے پہنچانے کی ذمہ داری کے معنی میں ولایتِ تشریعی صرف انبیاء سے مختص ہے جبکہ ولایتِ تکوینی کا دائرہ کار ولایتِ تشریعی سے وسیع تر ہے اور اس کی حدود میں تمام ایسے لوگ آتے ہیں جو نظامِ خارج پر اثر انداز ہونے کی قدرت رکھتے ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ ابحاث میں واضح ہو چکا ہے خود ولایتِ تکوینی تو سب افراد کے لئے ثابت ہے کیونکہ ہر انسان ولایتِ تکوینی کے ساتھ ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ مثلاً انسان جب بھی چاہتا ہے اپنے جسم کو حرکت دیتا ہے اور جس وقت چاہتا ہے اسے بستر پر لٹا دیتا ہے اور پھر جسم سے اپنا رابطہ حیاتِ نباتاتی یا کم مقدار میں حیاتِ حیوانی کی حد تک نیچے لے آتا ہے اور یوں وہ عالمِ خواب میں چلا جاتا ہے۔ پھر اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اچھے یا بُرے خواب اسے نصیب ہوتے ہیں۔ اسی طرح روزمرہ کے دوسرے تصرفات کہ جو ہر انسان اپنے بدن پر انجام دیتا ہے سب کے سب روح کی ولایتِ تکوینی کا نتیجہ ہیں کیونکہ بیرونی امور میں ہمارے معمول کے تصرفات اگرچہ اعضائے بدن کے ذریعے انجام پاتے ہیں لیکن اعضائے بدن میں یہ تصرفات درحقیقت فکر اور ارادے کا نتیجہ ہوتے ہیں جو عقلِ عملی اور عقلِ نظری کے امور میں سے ہے۔

ولایتِ تکوینی کے ساتھ ہمارا اس حد تک مانوس ہونا مچھلی کے پانی کے ساتھ انس کی مانند ہے اس طرح کہ جیسے مچھلی پانی سے غافل ہوتی ہے ہم بھی روح کی بدن پر ولایتِ تکوینی سے غافل ہیں۔

اس ولایت سے بالاتر وہ تصرفات ہیں جو روح بیرونِ بدن انجام دیتی ہے۔ قرآنِ مجید نے انبیاء کی ایسی ہی ولایت کے بہت سے نمونے ذکر کیے ہیں اور ساتھ ہی اس کے راز کی بھی وضاحت کی ہے۔ ان میں سے کچھ کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

پہلا نمونہ: حضرت مریم سلام اللہ علیہا

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"اذ قالت امرات عمران ربّ انّی نذرت لک ما فی بطنی محرّرًا فتقبّل منّی انّک انت السّمیع العلیم، فلما وضعتها قالت ربّ انّی وضعتها انثٰی واللہ اعلم بما وضعت ولیس الذّکر کالانثٰی وانّی سمّیتها مریم وانّی اعیذها بک وذرّیّتها من الشّیطان الرّجیم، فتقبّلها ربّها بقبول حسن وانبتها نباتًا حسنًا وکفّلها زکریّا کلّما دخل علیها زکریّا المحراب وجد عندها رزقًا قال یا مریم انّٰی لک هٰذا قالت هو من عند اللہ انّ اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب"

(آل عمران - ۳۵ تا ۳۷)

جب زکریا سلام اللہ علیہ نے اللہ تعالٰے کی طرف سے مریمؑ کو اپنی کفالت میں لیا اور یہ بی بی ان کی سرپرستی میں پروان چڑھیں تو ہر بار جب بھی زکریاؑ ان کے پاس جاتے تو ان کے پاس غیر موسمی پھل مشاہدہ کرتے۔ یہی چیز دیکھ کر حضرت زکریاؑ

نے ان سے پوچھا کہ یہ روزی تمہیں کہاں سے ملتی ہے ؟ مریم سلام اللہ علیہا نے جواب دیا کہ اللہ کی طرف سے۔ زکریا علیہ السلام کے لیئے یہ جواب ایسا تھا کہ آپؑ نے بغیر تحقیق کے اسے فوراً قبول کرلیا۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

"ان اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب"

یعنی خدا جسے چاہتا ہے بے حساب روزی عطا کرتا ہے۔

اس آیت کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالےٰ کی عطا و بخشش کا کوئی حساب و کتاب نہیں اس لئے کہ "حسیب" (حساب کرنے والا) خود اللہ تعالےٰ کے اسماء میں سے ہے اور قرآن میں بھی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"وکل شیٔ عندہ بمقدار" (رعد - ۸)

(اور ہر چیز اس کے پاس ایک خاص مقدار میں ہے)

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"انا کل شیٔ خلقناہ بقدر" (قمر - ۴۹)

(ہم نے ہر چیز کو ایک خاص مقدار کے مطابق خلق کیا ہے۔)

پس مذکورہ آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی بخشش و عطا کی کیفیت و کمیت ایسی ہے کہ وہ بے حساب ہے یعنی خداوند تعالےٰ اس طرح روزی دیتا ہے کہ حساب و کتاب میں نہیں آتی یا یہ کہ اس کا روزی دینے کا انداز ایسا ہے کہ کوئی دوسرا حساب و کتاب کے ذریعے اسے سمجھ نہیں سکتا۔

بہرحال یہ خود ایک طرح کی ولایت ہے یعنی ایسا شخص جو پیغمبر تو نہیں لیکن ایسے بلند مقام تک جا پہنچا ہے کہ اللہ تعالےٰ اسے وہ رزقِ کریم عطا کرتا ہے جو دوسروں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

ولایت کا یہ عظیم مقام کہ مریم سلام اللہ علیہا میں جس کا ظہور ہوا موجب بنا کہ زکریاؑ، یحییٰ علیہ السلام جیسے فرزندِ صالح کی پیدائش کے لیے دعا کریں کیونکہ حضرت زکریا سلام اللہ علیہ نے جب مریم سلام اللہ علیہا سے اس فضیلت کا مشاہدہ کیا تو ان کے

دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ تعالےٰ انھیں بھی اسی طرح کی اولاد نصیب فرمائے۔

«ھنالک دعا زکریا ربہ قال رب ھب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ انک سمیع الدعاء»

(آل عمران - ۳۸)

لہٰذا اللہ تعالےٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰ سلام اللہ علیہ جیسی نعمت سے نوازا تاکہ وہ بھی «بغیر حساب» کے اس رزقِ کریم سے بہرہ مند ہوں۔ البتہ حضرت یحییٰ سلام اللہ علیہ مقامِ نبوت تک جا پہنچے اور یوں ولایتِ تشریعی کے مقامِ منیع پر فائز ہوئے جبکہ مریم سلام اللہ علیہا کو یہ مقام حاصل نہ تھا اور وہ صرف ولایتِ تکوینی رکھتی تھیں۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی ولایتِ تکوینی پر ایک اور شاہد یہ ہے کہ وہ نظامِ تکوین میں عملی تصرفات کے علاوہ علمی تصرفات بھی کرتی تھیں کہ جو بعد کے واقعات کی پیش گوئی کے لحاظ سے معجزے کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

«اذ قالت الملائکۃ یا مریم ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسی ابن مریم وجیھا فی الدنیا والاخرۃ ومن المقربین و یکلم الناس فی المھد وکھلا ومن الصالحین» (آل عمران - ۴۵ و ۴۶)

یہ پیشگوئی درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کا ظہور ہے جو آپؑ کی والدہ گرامی میں وقوع پذیر ہوا۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں جب عیسیٰ سلام اللہ علیہ کے واقعے کا ذکر ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:

«اذ قال اللہ یا عیسی ابن مریم اذکر نعمتی علیک وعلی والدتک اذ ایدتک بروح القدس تکلم الناس فی المھد وکھلا»

یعنی خدا نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام سے فرمایا، یاد کرو اپنے اور اپنی والدہ کے اوپر ہماری نعمتوں کو کہ جب ہم نے روح القدس کے ذریعے تمہاری تائید و مدد کی تاکہ تم بچپن اور "کہولت" میں لوگوں کے ساتھ باتیں کرو۔

بعض مفسرین نے مذکورہ آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس آیت میں ایک غیبی اعلان ہے اور وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ سلام اللہ علیہ بڑھاپے تک نہیں پہنچ پائیں گے کیونکہ آیت میں بچپن اور کہولت میں باتیں کرنے کا ذکر ہے جبکہ کہولت جوانی اور بڑھاپے کے درمیان والی عمر کو کہتے ہیں (یعنی تقریباً ۴۰ سال کے بعد سے)۔

بعد میں وقوع پذیر معجزے کی پیش گوئی کہ جو درحقیقت معجزۂ عیسیٰؑ کا ان کی مادرِ گرامی میں ظہور تھا، نیز ارتباطِ مریم و عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر ذکر موجود ہے۔

قرآنِ پاک کے مطابق عیسیٰ و مریم علیہما السلام دراصل ایک ہی حقیقت ہیں کہ جو مادر و فرزند کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں کیونکہ ان دونوں کو ایک ہی آیت اور نشانی کے طور پر یاد کیا گیا ہے اس کے علاوہ کبھی اسمِ مریمؑ اسمِ عیسیٰؑ سے پہلے ذکر ہوا ہے مثلاً ذیل کی آیت میں۔

"وجعلناھا وابنھا آیۃ للعالمین" (انبیاء - ۹۱)

اور کبھی اس کے برعکس ذکر ہوا ہے، مثلاً

"وجعلنا ابن مریم وامّہ آیۃ" (مومنون - ۵۰)

تیسرا شاہد مریم سلام اللہ علیہا کے لیئے ماں بننے کے دوران میں روحِ خدا کا ان کے لیے تمثل تھا۔ قرآنِ پاک اس منظر کو یوں بیان فرماتا ہے

"فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرًا سویًا قالت انّی اعوذ بالرّحمٰن منک ان کنت تقیًا، قال انّما انا رسول ربّک لاھب لک غلامًا زکیًا، قالت انّٰی یکون لی غلامٌ ولم یمسسنی بشر ولم اک

بغیاً قال کذٰلکِ قال ربّک ھو علیّ ھیّن ولنجعلہ
اٰیۃ للناس و رحمۃ منّا وکان امراً مقضیّا "

(مریم ۱۷ - ۲۱)

یعنی جب اللہ تعالےٰ نے ارادہ کیا کہ مریم سلام اللہ علیہا کو شوہر کے بغیر ماں بنائے تو روحِ خدا کو ان کی طرف بھیجا اور یہ فرشتہ ایک صحیح انسان کی صورت میں مریم سلام اللہ علیہا کے لیے متمثل ہوا اور مریم سلام اللہ علیہا نے جب اس تمثیلی صورت میں فرشتے سے پہلی بار ملاقات کی تو کہا کہ تیرے شر اور برائی سے میں اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔

اس کے بعد متمثل فرشتے نے انہیں فرزند کی خوشخبری سنائی تو مریمؑ نے بغیر شوہر کے ایک عورت کے ماں بننے پر تعجب کیا تو اس فرشتے نے فرمایا کہ خداوندِ عالم نے ارادہ کیا ہے کہ آپ بغیر شوہر کے ماں بنیں۔

دوسرا نمونہ: آصف بن برخیا

سورۂ نمل میں ہے:

"قال یا ایّھا الملؤا ایّکم یأتینی بعرشھا قبل ان یأتونی مسلمین، قال عفریت من الجنّ انا اٰتیک بہ قبل ان تقوم من مقامک وانّی علیہ لقوی امین، قال الذی عندہ علم من الکتاب انا اٰتیک بہ قبل ان یرتد الیک طرفک فلمّا راٰہ مستقرًّا عندہ قال ھٰذا من فضل ربّی لیبلونی ءأشکر ام اکفر و من شکر فانّما یشکر لنفسہ ومن کفر فانّ ربّی غنیّ کریم"

(نمل - ۳۸ تا ۴۰)

سلیمان سلام اللہ علیہ نے ملکۂ سبا کو معجزہ دکھایا تاکہ وہ جس طرح حکومتی طاقت کے لحاظ سے مطیع اور تسلیم ہے عقیدے اور ایمان کے لحاظ سے بھی

خود حضرت سلیمانؑ کی ماتند پروردگار عالم پر ایمان لائے اور کہے :

"اسلمت مع سلیمان للہ رب العالمین" (نمل ۴۴)

لہذا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے لشکر سے فرمایا: "کون ہے جو خود اس کے آنے سے پہلے اس کے عظیم تخت کو حاضر کرے؟ عفریت جو ایک جن کا نام ہے اس نے کہا کہ اس سے پہلے کہ آپؑ اپنی جگہ سے اٹھیں یعنی اس محفل کو شروع ہوئے آدھا دن گزر جائے یا آپؑ کی یہ نشست اختتام پذیر ہو، میں تخت کو لے آؤں گا۔

گویا یہ مدت زیادہ تھی لہذا حضرت سلیمان سلام اللہ علیہ نے اسے اجازت نہ دی۔ اس کے بعد ایک آدمی نے کہ جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا، یہ کہا کہ آپؑ کے پلک جھپکنے سے بھی کمتر مدت میں اسے حاضر کرتا ہوں اور یہ بیان کے لحاظ سے کمترین امکانی مدت ہے۔

آیت کے بعد والے حصے سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اسے اجازت دی اور آپؑ کی اجازت سے اس شخص نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا۔ یہاں پر بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ تخت لانے والے خود حضرت سلیمانؑ تھے اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ تخت لانے کو حضرت سلیمانؑ کے معجزات میں شمار کریں جب کہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ اس کام کو آپؑ کے بجائے کسی اور نے انجام دیا تھا۔

اس لحاظ سے یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غیر پیغمبر سے بھی ایسی کرامت واقع ہو سکتی ہے کہ جو طی الارض سے بھی قوی تر ہو کیونکہ طی الارض انتہائی کم مدت میں خود سے بہت طولانی مسافت طے کرنے کو کہتے ہیں جبکہ اس کام میں طی الارض کے علاوہ کسی دوسری چیز کو اٹھانا بھی شامل ہے۔

یہاں ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ عقلی طور پر کس طرح ممکن ہے کہ جو تخت بہت دور فاصلے پر موجود ہو پلک جھپکنے سے بھی کمتر مدت میں حاضر ہو

جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ٹھیک ہے معمولاً ایسا کرنا محال ہے لیکن عقلاً محال نہیں کیونکہ اگرچہ معمول تو یہی ہے کہ اس طرح کی حمل و نقل عام طور پر زیادہ مدت میں انجام پاتی ہے لیکن عقلاً کوئی مانع نہیں کہ یہ کام کمتر مدت میں انجام پائے۔ اصولاً معجزہ اور کرامت اسی لحاظ سے معجزہ اور کرامت ہوتے ہیں کہ عام طور پر انہیں بجالانا محال ہوتا ہے اگرچہ ایسے کام ذاتی یا وقوعی لحاظ سے محال نہیں ہوتے۔

بعض نے تخت کے منتقل ہونے کے مسئلے کا جواب یوں دینا چاہا ہے کہ ہر موجود ہر لحظہ و ہر آن اللہ تعالےٰ سے فیضِ جدید پاتا ہے لہٰذا کوئی مضائقہ نہیں کہ تختِ بلقیس نے چند لمحہ پہلے سباء میں اور اس کے چند لمحے بعد حضرت سلیمانؑ کے حضور فیضِ وجود حاصل کیا ہو۔ اس جواب کے لیے نہ تو کوئی راہِ ثبوت ہے اور نہ ہی عقلی دلائل اس کی تائید کرتے ہیں کیونکہ اس جواب کا لازمہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز کے متعدد وجود ہوں اور ہر لمحے اس کا وجود حادث ہو اور مرحلۂ قبل سے جدا اور مختلف ہو، مگر یہ کہ اس جواب سے مراد یہ ہو کہ اذنِ خداوندی سے یہ حمل و نقل بہت تیزی سے وقوع پذیر ہوا ہو۔ اس صورت میں اس جواب اور مذکورہ جواب میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ گذشتہ واقعے میں چند نکات ایسے ہیں جن کی طرف توجہ ضروری ہے۔

نکتۂ اوّل: جس شخص کی طرف تخت کو منتقل کرنے کی نسبت دی گئی ہے قرآن میں اس کا نام ذکر نہیں ہوا لیکن "عفریت من الجن" کے ساتھ جو تقابل موجود ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ انسانوں میں سے تھا۔

نکتۂ دوم: جس طرح "اکرم العلماء" کے جملے میں ذکرِ وصف علتِ حکم کو بیان کرتا ہے اسی طرح "قال الذی عندہ علم من الکتاب" کے جملے میں بھی وصف یہ بتاتا ہے کہ اس شخص کا منبعِ ولایت اس کی معرفتِ کتاب

تھی۔

نکتۂ سوم: وہ کتاب کہ جو تکوین میں تصرف کا موجب ہے کوئی انسانی کتاب نہیں ہوسکتی کیونکہ انسانی کتاب اعتباری الفاظ و خطوط پر مشتمل ہے کہ جن کا وجود صرف کتبی صورت میں ہے جبکہ نہ صرف وجودِ کتبی بلکہ اشیاء کا وجودِ ذہنی بھی کسی بیرونی تصرف یا تاثیر کا باعث نہیں بن سکتا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسی معرفت کہ جو ولایت کا موجب بنتی ہے وہ درس و بحث اور علمِ مفہومی سے جدا ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ جو حقیقت و واقعیت کے ساتھ گندھی ہوئی ہے اور ہمیشہ اس کے ہمراہ ہے اور یہ علمِ شہودی اور حضوری سے عبارت ہے۔

نکتۂ چہارم: ایسی معرفت کہ جو منشاء ولایت ہے وہ امانت کے ہمراہ ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد ہوتا ہے " وانّی علیہ لقوی امین " اور اگر یہ آیت نہ بھی ہوتی تب بھی یہ مسئلہ قابلِ اثبات تھا کیونکہ خائن کی روح اچھے خواب دیکھنے تک سے محروم ہے چہ جائیکہ وہ ایسی معرفت تک دسترس حاصل کرے کہ جو باعثِ ولایت ہو۔

روحِ خائن ممکن ہے بیداری میں اپنے آپ کو امین کے طور پر پہچنوائے لیکن جیسے ہی عالمِ غیب کی طرف سفر کرے اس کی خیانت ظاہر ہو جاتی ہے کیونکہ جب ایک نورانی حقیقت ایک جھوٹے شخص کو خواب میں نصیب ہوتی ہے تو پہلے سے موجود بہت سی چیزیں اس کے ساتھ اضافہ ہو جاتی ہیں اور یہ ان گھاس پھوس اور بوٹیوں کی مانند ہو جاتی ہے کہ جو ایک پھولدار پودے کے اردگرد اگی ہوتی ہیں اور خواب میں یہ انتشار انسان کی روزمرّہ کی پریشانیوں اور ذہنی خلفشار پر دلالت کرتا ہے۔ یہ چیز موجب بنتی ہے کہ جو کچھ وہ خواب میں دیکھتا

ہے اسے " اضغاث احلام[1]" کہا جائے کیونکہ " ضغث " گھاس پھوس کی گٹھڑی کو کہتے ہیں اور اضغاث اس کی جمع ہے یعنی بہت سی گٹھڑیاں جھوٹے شخص کی لوحِ نفس پر جب آسمان معانی سے کوئی پاک وطیب بوٹا اگتا ہے تو جنگلی گھاس اور بوٹے اس طرح اس کے اطراف میں اگ جاتے ہیں کہ اصل پودا ان میں چھپ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ ان میں یوں غائب ہو جاتا ہے کہ اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ اس لحاظ سے جو شخص بھی گفتار و کردار میں راہِ راست سے منحرف ہے یا جھوٹا اور خائن ہے ہرگز صحیح معرفت تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک انسان کو معرفتِ حقیقی نصیب نہ ہو مسلّم ہے کہ اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی ولایت بھی اسے نصیب نہ ہوگی۔

نکتۂ پنجم: اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ شخص " اسمِ عظیم " یا " اسمِ اعظم " کو جانتا تھا اور جیسے ہی یہ اسم زبان پہ لایا پلک جھپکنے سے بھی کمتر مدت میں تختِ سبا سے سلیمان سلام اللہ علیہ کے حضور پہنچ گیا اور اس اسم میں بھی اختلاف ہے کہ آیا " یا حیّ، یا قیوم " ہے یا ایک عبرانی کلمہ ہے مثلاً " اھا شراھا " وغیرہ۔

جس اصلی نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کسی لفظ (کے بولنے سے) یا لکھائی یا مفہوم کے ذریعے ہرگز بیرونی نظام پر اثر انداز نہیں ہوا جا سکتا کیونکہ نظامِ ہستی ایک نظامِ علّی یعنی علت و معلول والا نظام ہے اور نظامِ علّی میں وجودِ کتبی، لفظی یا ذہنی کہ جو نہایت ضعیف ہیں بیرونی طور پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ وجودِ لفظی اور وجودِ کتبی ہر دو اعتباری اور

---

[1] احلام، حلم کی جمع ہے اور یہ خواب کے معنی میں ہے۔ (مترجم)

قرار دادی وجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اقوام کے ہاں الفاظ اور خطوط بھی مختلف ہیں اور قرار داد و اعتبار کے لحاظ سے متفاوت بھی ہوتے ہیں۔ قرار دادی اور اعتباری امور فقط اعتبار اور قرار داد کی حدود میں موجود ہوتے ہیں اور عالم تکوین میں بے اثر ہوتے ہیں۔ مفاہیم اگرچہ امورِ اعتباری کی طرح قرار داد سے وابستہ نہیں ہوتے لیکن وجودِ ذہنی کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور وجودِ ذہنی بہت ضعیف حقیقت کا حامل ہے جو بیرونی نظام پر اثر انداز نہیں ہو سکتا، کیونکہ جو چیز بیرونی نظام پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اوّلاً تو وہ وجودِ حقیقی رکھتی ہو اور ثانیاً خود اپنے اثر سے قوی تر ہو۔ وجودِ ذہنی اگرچہ وجودِ حقیقی کا حامل ہے لیکن اس کا یہ وجود ظلی اور طفیلی ہے۔ پس وہ اسمِ اعظم کہ جو خارج میں اثر انداز ہوتا ہے اسے لفظ و مفہوم سے بالاتر ایک حقیقت کا حامل ہونا چاہیے۔

یہیں سے دعائے سمات کی طرح دیگر ادعیہ میں مذکور مطالب کا معنی سمجھ میں آتا ہے۔ ان دُعاؤں کے بعض حصوں میں اللہ تعالےٰ کو اس کے اسماء کی قسم دی گئی ہے۔ مثلاً "تجھے اس نام کی قسم کہ جس کے ذریعے تو نے زمین کو خلق کیا اور پہاڑوں کو بلند کیا"۔ اس طرح کے جملوں میں اسماء سے مراد فیوضاتِ الٰہیہ ہیں کیونکہ انہی فیوضات کے ذریعے آسمان و زمین خلق ہوئے جبکہ اسمائے لفظی ان امورِ اعتباری میں سے ہیں جو ان اسمائے حقیقی کے لیے وضع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اسماء کو "اسماء الاسماء" بھی کہتے ہیں۔

اسم اور اسم الاسم کے درمیان فرق اسم و مسمّٰی کے درمیان وحدت یا اختلاف کی بحث سے بھی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ یہی چیز باعثِ اختلاف ہے۔ کیونکہ وہاں اسم و مسمّٰی کے درمیان وحدت یا اختلاف سے مراد یہ ہے کہ وہ حقائقِ تکوینی کہ جو مسمّٰی اور صاحبِ علامت کے لیے علامت اور نشانی ہیں کیا وہ عینِ مسمّٰی ہیں یا اس سے مختلف کوئی اور چیز ہیں؟ اسی طرح اسم تعین خاص کے ساتھ ذاتِ مطلق سے عبارت ہے اس کے برعکس خود ذات وہی غیر متعین ہستی ہے اور

یہ صفت کے بھی برعکس ہے کہ جو تعین ہی ہے۔ اُس مسئلے میں ہم پہلے یہ کہہ چکے ہیں کہ ایک لحاظ سے اسم عین مسمّٰی ہے جبکہ دوسرے لحاظ سے اس سے مختلف ہے۔

اس نکتے کا حاصل یہ ہے کہ اسمِ اعظم کو جاننا لفظی یا مفہومی لحاظ سے نہیں بلکہ یہ علم عظیم ترین اسماء سے روح کے مانوس ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ بات اس وقت تحقق پذیر ہوتی ہے جب وہ اسم روحِ انسان میں متجلی ہو۔ ایسا شخص کہ جس میں اسمِ اعظم کا ظہور ہوا ہو اور اُس نے اس اسم سے شہودی رابطہ برقرار رکھا ہوا سے "عندہ علمٌ من الکتاب[1]" کہا جا سکتا ہے اور چونکہ اُس شخص میں ایسے اسم نے ظہور کیا ہے کہ جو اسم باعثِ خلقتِ زمین و زمان ہے اور سمندروں اور آسمانوں کی پیدائش کا موجب ہے، لہٰذا ایسا شخص پلک جھپکنے سے بھی کمتر مدت میں جو کچھ زمین و زمان سے مربوط ہے اس میں تصرف کر سکتا ہے۔

نکتۂ ششم

: سورۂ رعد کی آخری آیت جو امیر المؤمنین علیہ السلام پر منطبق ہوتی ہے، جو کچھ سورۂ نمل کی آیات میں موجود ہے اس سے بھی زیادہ پر دلالت کرتی ہے۔

"ویقول الذین کفروا لست مرسلاً، قل کفیٰ باللہ شہیداً بینی و بینکم و من عندہ علم الکتاب"

(رعد - ۴۳)

اس آیت میں رسولؐ اللہ کی رسالت کے منکر مشرکینِ مکہ کے جواب میں دو گواہ ذکر کیئے گئے ہیں۔ پہلا گواہ جو بالاترین ہے، خود اللہ تعالیٰ ہے کہ جو اپنے پیغمبرؐ کو کتاب دے کر اس کی رسالت کی گواہی دیتا ہے۔ دوسرا گواہ وہ ہے جس کے پاس علمِ کتاب ہے۔

---

[1] یعنی اس کے پاس کتاب کا کچھ علم ہے۔ (مترجم)

"جس کے پاس علمِ کتاب ہے" کی تعبیر "جس کے پاس کچھ علمِ کتاب ہے" کی تعبیر سے قوی تر ہے۔ کیونکہ پہلی تعبیر امیر المومنین علیہ السلام پر منطبق ہوتی ہے جو تمام کتاب پر آپ کے عبور اور تسلط پر دلالت کرتی ہے جبکہ دوسری تعبیر جو سورۂ نمل میں ہے وہ اس معنی پر دلالت نہیں کرتی۔

نکتۂ ہفتم: یہاں ہم ایک دفعہ پھر ابتدائی مطلب کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ یہ کہ ولی اللہ کی ولایت اللہ کی ولایت کے نہ تو عرض میں ہے اور نہ ہی طول میں، بلکہ وہ ولایتِ الٰہی کا مظہر ہے اور ہماری زیرِ بحث آیات بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہیں کیونکہ جب سلیمانؑ نے اپنے زیرِ تربیت افراد میں سے ایک فرد کے تخت پر قدرتِ تصرف کا مشاہدہ کیا تو یہ نہیں کہا:

"انما اوتیتہ علی علم عندی"[1]

یعنی اس قدرت کو آپ اپنی طرف سے یا دوسروں کی طرف نہیں جانتے تھے کیونکہ خود بینی یا دیگر بینی ہر دو حجاب ہیں اور جو حجاب سے عبور نہ کرے وہ ولایت تک نہیں پہنچ پاتا۔

لہٰذا سلیمان سلام اللہ علیہ نے اس قدرت کو خدا کی جانب سے مشاہدہ کیا اور کہا:

"ھٰذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر ومن شکر فانما یشکر لنفسہ ومن کفر فان ربی غنی کریم"[2]

والحمد للہ رب العالمین

---

[1] قصص - ۷۸ [2] نمل - ۴۰

درس ۲۰

تیسرا نمونہ: مادرِ حضرت موسیٰ علیہ السلام

ایسے انسانوں کا تیسرا نمونہ کہ جو پیغمبر تو نہ تھے لیکن نظامِ تکوین میں علمی یا عملی ولایت کے حامل تھے مادرِ موسیٰ سلام اللہ علیہا ہیں۔ سورۂ قصص کی آیت ۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

"واوحینا الی امّ موسیٰ ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیمّ"

یعنی ہم نے وحی کے ذریعے مادرِ موسیٰ کو اطلاع دی کہ اس بچے کو دودھ پلائے اور اگر خطرہ محسوس کرے تو اسے دریا میں ڈال دے۔

سورۂ طٰہٰ کی آیات ۳۸ اور ۳۹ میں جہاں مذکور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مادرِ موسیٰ کو حکم دیا کہ بچے کو دریا میں ڈال دے وہاں ارشاد ہوتا ہے دریا کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ اسے ساحل تک پہنچائے۔

"اذ اوحینا الیٰ امّك ما یوحیٰ، ان اقذفیہ فی التّابوت فاقذفیہ فی الیمّ فلیلقہ الیمّ بالساحل"

سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولا تخافی ولا تحزنی" (قصص-۷)

یعنی ہم نے اسے وحی کی کہ نہ ڈرے اور نہ ہی غمگین ہو۔

مادرِ موسیٰؑ کے لیے فرمانِ الٰہی کہ جو وحی کی صورت میں تھا صرف لفظی پند و نصیحت نہ تھا کہ جو خوف کے ایسے مواقع پر بے اثر یا کم اثر ہوتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا القاء تھا کہ اگر حزن و ملال موجود ہو تو اسے دور کر دیتا اور اگر آنے کا احتمال ہو تو اسے آنے نہ دیتا۔

مادرِ موسیٰ علیہا السلام سے مربوط اس آیت میں خوف و ہراس سے منع کرنے

کی نسبت اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف دی ہے لیکن دوسرے با استقامت مومنین کے لیے اس پیغام کے ارسال کی نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے۔

سورۂ حٰم السجدہ کی آیہ ۳۰ میں اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون"

یعنی فرشتے با استقامت مردوں پر نازل ہوتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غمگین ہو۔

البتہ ان دونوں نسبتوں میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ فرشتے امر الٰہی پر مامور اور مدبر ہیں اور اذنِ خدا سے کام انجام دیتے ہیں بلکہ در حقیقت یہ اللہ ہی کا کام ہے جو فرشتوں کے ذریعے ظہور کرتا ہے۔ لہٰذا اس کام کو مظہر کی طرف بھی نسبت دی جا سکتی ہے کہ جو فرشتے ہیں اور ظاہر کی طرف بھی کہ جو خدا کی ذات ہے۔

سورۂ قصص کی بعد والی آیات میں مادرِ موسیٰ سے حزن و اندوہ کے دُور ہونے کا راز بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"واصبح فؤاد ام موسیٰ فارغاً ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علیٰ قلبھا لتکون من المؤمنین" (قصص۔۱۰)

یعنی اگر ہم اس کے دل کو اپنے سے مربوط نہ کرتے تو ممکن تھا کہ وہ خوف اور غم و اندوہ کی شدت سے متاثر ہوتیں۔ اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ خدا سے ارتباط کہ جو جمیلِ محض اور قدیرِ صرف ہے، غم و اندوہ اور خوف و ہراس سے نجات کا باعث بنتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ غم گذشتہ سے مربوط ہے اور خوف و ہراس کا تعلق آئندہ سے ہے۔ جس شخص نے ماضی میں کوئی نقصان اٹھایا ہے وہ غمگین ہے اور جس آدمی کو احتمال ہو کہ آئندہ اسے کوئی نقصان ہوگا تو وہ خائف بھی ہوتا ہے اور غمگین بھی۔ اس لحاظ سے انسان اگر اپنا دل مبدائے ہستی کے سپرد کر دے، جس کے ہاتھ میں گذشتہ اور آئندہ کی باگ ڈور ہے تو وہ

کبھی بھی غم واندوہ یا خوف وہراس میں مبتلا نہیں ہوگا۔

پس مادرِ موسیٰ علیہ السلام سے خوف وحزن کی نفی کہ جو "لا تخافی ولا تحزنی" کے القاء سے انجام پائی درحقیقت اس کے خدا کے ساتھ قلبی ارتباط کی وجہ سے تھی اور خدا کے ساتھ قلب کا یہ تکوینی ارتباط توحیدِ تام ہے اور اسی کا نام ولایت ہے۔

سورۂ قصص کی آیت ۷ کے اختتام پر مادرِ موسیٰ سلام اللہ علیہا پر غیبی الہام کے بارے میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔

"انا رادّوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین"

یعنی مادرِ موسیٰؑ کو یہ بشارت بھی دی گئی کہ ہم اسے تیری طرف لوٹا دیں گے اور اسے رسولوں میں سے قرار دیں گے۔ پس یہ بی بی خوف والے واقعات میں غیب سے آگاہی، اطمینانِ قلب، غم واندوہ اور خوف وہراس سے محفوظ رہنے کے لحاظ سے اولیائے الٰہی کا ایک کامل نمونہ شمار ہوتی ہیں۔

چوتھا نمونہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ

چوتھا نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ ہیں جو فرشتوں کی گفتگو سنتی بھی تھیں اور ان سے گفتگو کرتی بھی تھیں۔ سورۂ ہود کی آیات ۶۹ تا ۷۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولقد جاءت رسلنا ابراھیم بالبشریٰ قالوا سلاماً قال سلام فما لبث ان جاء بعجل حنیذ، فلما رأیٰ ایدیھم لا تصل الیہ نکرھم واوجس منھم خیفۃً قالوا لا تخف انا ارسلنا الیٰ قوم لوط، و امراتہ قائمۃ فضحکت فبشرناھا باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب، قالت یا ویلتیٰ

قالت یا ویلتیٰ ءالد وانا عجوز وھذا بعلی شیخاً ان ھذا لشیء عجیب، قالوا أتعجبین من امر اللہ رحمت اللہ و برکاتہ علیکم اھل البیت انہ حمید مجید"

ان آیات میں سے کچھ میں حضرت ابراہیم سلام اللہ علیہ کے تکلم کے بارے میں ذکر ہوا ہے اور اس سے بحث معجزات انبیاء علیہم السلام سے بحث کے دائرہ کار میں آتی ہے جو اُن کی ولایتِ تکوینی سے مربوط ہے، جبکہ دیگر آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ کی فرشتوں سے گفتگو کا ذکر ملتا ہے۔ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ نے ولادتِ اسحقؑ و یعقوبؑ کی بشارت جب فرشتوں سے سنی تو متعجب ہوئیں اور حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد فرشتوں سے اس کا جواب سنا کہ کیا تم امر خدا اور اس کی رحمت و برکت پر متعجب ہو؟

زوجۂ ابراہیم، مادرِ موسیٰ اور حضرت مریم علیہم السلام وہ خواتین ہیں جنہوں نے فرشتوں سے گفتگو کی یا ان کی گفتگو کو سنا اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اگرچہ وہ رسالت و نبوت پر فائز نہ تھیں لیکن پھر بھی ولایت سے بہرہ مند تھیں کیونکہ ولایتِ نبوت اجرائی امور میں سے ہے جو مردوں سے مختص ہے۔

"وما ارسلنا من قبلك الا رجالاً نوحی الیھم"۔

(یوسف ۱۰۹)

جبکہ ولایت باطنِ نبوت ہے اور انسانِ کامل کے خدا کے ساتھ ارتباط کا ایک نمونہ ہے۔ اور یہ سب کچھ انسانی کمال سے مربوط ہے جو مردوں سے مختص نہیں لہٰذا اس میں مرد و زن کے درمیان کوئی فرق نہیں، اگرچہ ممکن ہے کہ اس کا بالاترین درجہ مردوں سے مختص ہو لیکن راہِ کمال ہر دو کیلئے کھلی ہے۔

پانچواں نمونہ: اصحابِ کہف۔

قرآنِ مجید میں اصحاب کہف کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

"نحن نقص علیک نبأھم بالحق انھم فتیة امنوا بربھم و زدناھم ھدًی و ربطنا علٰی قلوبھم اذ قاموا فقالوا ربنا رب السمٰوات والارض لن ندعوا من دونہ الٰھا لقد قلنا اذًا شططًا ھٰؤلاء قومنا اتخذوا من دونہ اٰلھة لولا یأتون علیھم بسلطان بیّن فمن اظلم ممّن افترٰی علی اللہ کذبًا" (کہف۔۱۳ تا ۱۵)

یعنی وہ مومن جوان تھے اور جب انہوں نے استقامت کی تو اللہ نے ان کے دلوں میں اپنے سے ربط و تعلق کو ایجاد فرمایا۔ یہی ربط و تعلقِ الٰہی سورۂ حٰم السجدہ میں ذکر شدہ کبرائے کلی کے لیے ایک مصداق ہے:

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزّل علیھم الملائکة الا تخافوا ولا تحزنوا و ابشروا بالجنة التی کنتم توعدون" (حٰم السجدہ۔۳۰)

یعنی جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور پھر استقامت کی ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور انہیں خوف و حزن سے نجات دیتے ہیں اور بہشت کی بشارت دیتے ہیں۔

اصحابِ کہف بھی انہی لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مذکورہ آیت پر عمل کیا اور "قاموا" یعنی قیام کیا۔

"فقالوا ربنا رب السمٰوات والارض"

یعنی انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار زمین اور آسمانوں کا پرودگار ہے۔ اسی وجہ

سے اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں کو اپنے سے مربوط کر لیا۔ یہی ارتباطِ قلوب ہے جو ملائکہ کے نزول اور خوف و حزن کے دُور ہونے کا راز ہے جسے دعائے کمیل میں یوں بیان کیا گیا ہے: "وقلبی بحبّك متیّما" اور مادرِ موسیٰ علیہا السلام کے واقعے میں بھی ذکر ہوا ہے کیونکہ جب دل محبتِ خدا سے بھر جائے اور غیرِ خدا کی محبت اس تک پہنچنے نہ پائے تو وہ خدا کے ساتھ رابطہ برقرار کر لیتا ہے اور جو دل خدا سے رابطہ برقرار کرے تو شیطان کے نفوذ کے راستے بند ہو جاتے ہیں اور ملائکہ کے نزول کے لئے راستے کھل جاتے ہیں۔ جب فرشتے نازل ہوں تو غم اور خوف دل سے نکل جاتا ہے اور جس کے دل میں غم و اندوہ اور خوف و ہراس نہ رہے تو وہ استقامت میں شاکر ہو جاتا ہے نہ کہ صابر، کیونکہ صبر ایسے شخص کیلئے ہے جو جہادِ اکبر کے میدان میں حزن و خوف کے ساتھ ہمیشہ مصروفِ جہاد ہے۔

اس دعوے پر ایک گواہ مادرِ موسیٰ علیہا السلام کی وہ داستان ہے جو آیت "ربطنا علیٰ قلبہا" کے ذیل میں ذکر ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک اور شاہد حضرت سید الشہداء علیہ السلام کا وہ قول ہے جو انہوں نے اپنی دخترِ گرامی حضرت سکینہ سلام اللہ علیہا کی توصیف میں حسن مثنیٰ سے فرمایا:

"واما السکینۃ فغالب علیہا الاستغراق مع اللہ"

یعنی میری بیٹی سکینہؑ تزکیۂ نفس سے اُس مقام پر جا پہنچی ہے کہ ذاتِ حق تعالےٰ میں مستغرق ہو گئی ہے اور مقامِ فنا پر فائز ہو گئی ہے اس طرح کہ جمالِ خدا کے علاوہ کوئی بھی جمال اسے اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا اور قہر و جلالِ الٰہی کے علاوہ کوئی بھی خوفناک حادثہ اسے ڈرا نہیں سکتا۔

جی ہاں! ولایت کے اسی عظیم الشان مقام اور قدیرِ صرف اور علیمِ محض کے ساتھ قلبی رابطے کی وجہ سے ہی تھا کہ کربلا جیسے دردناک واقعے میں دلخراش اور جانگداز مصائب اسے جمالِ الٰہی کے شہود سے ہٹا کر ہرگز اپنی طرف متوجہ نہ کر پائے۔

اسی ارتباط کے دیگر آثار میں سے ایک اصحاب کہف کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔ وہ تین سو نو سال قمری اور تین سو سال شمسی پر مشتمل ایک لمبی نیند تھی جو غذائی نظام کی مدد کے بغیر انجام پائی۔

" واذ اعتزلتموھم وما یعبدون الا اللہ فاوا الی الکھف ینشر لکم ربکم من رحمتہ ویھیئ لکم من امرکم مرفقاً وتری الشمس اذا طلعت تزاور عن کھفھم ذات الیمین واذا غربت تقرضھم ذات الشمال وھم فی فجوۃ منہ ذلک من ایات اللہ من یھد اللہ فھو المھتد ومن یضلل فلن تجد لہ ولیاً مرشداً، وتحسبھم ایقاظاً وھم رقود ونقلبھم ذات الیمین وذات الشمال وکلبھم باسط ذراعیہ بالوصید لو اطلعت علیھم لولیت منھم فراراً ولملئت منھم رعباً " (کہف ۱۶ تا ۱۸)

(اور جب تم نے ان لوگوں سے اور جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں، ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور غار میں پناہ لے لی تو تمہارا پروردگار تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلا دے گا اور وہ تمہارے معاملے میں سہولت کے اسباب فراہم کرے گا اور تو سورج کو دیکھتا ہے کہ جب وہ طلوع ہوتا تھا تو ان کی غار کے داہنی جانب سے ہٹ کر گزرتا تھا اور جب غروب ہوتا تو (غار میں) ان کو بائیں جانب چھوڑ جاتا تھا اور وہ غار کے اندر ایک کھلے حصے میں پڑے رہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو اس کے لیے ہرگز

کوئی سرپرست و ولی نہیں پائے گا اور تو انہیں جاگتا ہوا گمان کرتا رہا حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے اور ہم انہیں دائیں جانب اور بائیں جانب پہلو بدلواتے رہے اور ان کا کتا غار کے دہانے پر بازو پھیلائے بیٹھا رہا اور اگر تو انہیں جھانک کر دیکھتا تو ان سے اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرا دل ان کی دہشت سے بھر جاتا۔)

وہ تین سو سال نیند کی حالت میں رہے اور اللہ تعالےٰ کبھی کبھی انہیں ایک پہلو سے دوسرا پہلو بدلوا دیتا۔ یہ تین سو سالہ زندگی اور نیند کی حالت غذائی نظام سے استفادہ کیئے بغیر ایک غیر معمولی کام اور معجزہ ہے جبکہ دوسری طرف یہ ولایت کا ایک طبیعی اور عام سا نتیجہ ہے۔

جو لوگ اپنے دلوں کو اس کے سپرد کر دیتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیر تک آب و غذا کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ نے مذکورہ حکایت کے آغاز میں اس چیز کو اپنی ہمیشگی سنت کے طور پر یاد کیا ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اصحاب کہف کی داستان کوئی عجیب چیز ہرگز نہیں بلکہ یہ ہماری عام سی نشانیوں میں سے ہے۔

"ام حسبت ان اصحاب الکہف و الرّقیم کانوا من ایاتنا عجبًا" (کہف - ۹)

اور ولایت جو اللہ کی معجزہ نما نشانیوں میں سے ایک ہے خود دلی کے ساتھ متحد ہونا ہے لہٰذا اصحابِ کہف کو آیاتِ الٰہی کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

چھٹا نمونہ: حضرت خضر علیہ السلام

سورۂ کہف کی آیات میں ایک ایسے عبدِ صالح کا ذکر موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور علمِ لدنی کا حامل تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس سے علم حاصل کرنے کے

لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے اس کی جستجو میں نکلے۔ قرآن کریم اس بارے میں فرماتا ہے:

"فوجدا عبدًا من عبادنا اٰتیناہ رحمۃ من عندنا وعلّمناہ من لدنا علمًا، قال لہ موسیٰ ھل اتبعک علیٰ ان تعلّمن ممّا علّمت رشدًا" (کہف - ۶۵-۶۶)

یعنی جس بندے کو ہم نے رحمت دی اور علم سکھایا جب وہ اسے ملے تو موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ جس چیز کی آپ کو تعلیم دی گئی ہے کیا میں اس میں آپ کی پیروی کروں؟

یہ عبدِ صالح کہ موسیٰ علیہ السلام جس کی پیروی کرنے پر مامور تھے بعید ہے کہ انبیاء میں سے ہو اور اگر انبیاء میں سے بھی ہو تو جس قدر رحمتِ لدنی کا وہ حامل تھا یا جتنا علمِ لدنی وہ رکھتا تھا وہ سب اس کی ولایت سے مربوط تھا۔

علمِ لدنی، غیبِ جہان اور اس کے اسرار سے آگاہی کا نام ہے اور اسرار سے آشنائی کی وجہ سے ہی عبدِ صالح نے اس شخص کو قتل کیا تاکہ وہ فتنہ وفساد نہ پھیلائے اور کشتی میں سوراخ کیا تاکہ ظالم بادشاہ اسے چھین نہ سکے اور اسی بناء پر دیوار تعمیر کی تاکہ مالِ یتیم محفوظ ہو جائے۔

اسرارِ عالم پر آگاہی علمِ کتاب ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ البتہ کتاب کے علم میں مختلف مراتب و مدارج ہیں ان میں سے بعض درجے جو ولایت کا باعث بنتے ہیں معارفِ غیبی پر مشتمل ہیں جبکہ اس کے علاوہ دوسرے مدارج لفظی اور مفہومی ہیں۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"ویعلّمکم مالم تکونوا تعلمون" (بقرہ - ۱۵۱)

جیسا کہ مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے انسان خود سے کتاب کے کسی بھی مرتبے کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ البتہ پیغمبر کے ذریعے اسکے لفظی اور مفہومی مراتب

مدارج تک رسائی سب لوگوں کے لیے ممکن ہو گئی ہے۔

مثلاً کافر شخص انسان کے مادی اور طبیعی پہلوؤں سے مربوط بعض قوانین کو اختیار کر سکتا ہے اور ان پر عمل پیرا ہو سکتا ہے جبکہ کتاب کے غیبی علوم و معارف فقط تزکیۂ نفس کے ذریعے اور ادراکِ شہودی سے حاصل ہوتے ہیں اور خود انہیں نہ تو اپنی طرف سے بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اپنی طرف سے ان کا کوئی نعم البدل تیار کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کتاب کے غیبی مراحل کہ جو اسرارِ عالم کے علم پر مشتمل ہیں اللہ خالق کے اس فرمان کے بہترین مصداق ہیں:

"ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون"

ان مراتب تک رسائی ولایت کے علاوہ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔

کتاب روضۃ المتقین جو "من لا یحضرہ الفقیہ" کی شرح ہے میں معارفِ غیبیہ پر دسترس رکھنے والے افراد کی قلت کے بارے میں مجلسیٔ اوّل مرحوم رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ چالیس سال سے مرجعیت و سرپرستی، تدریس، تصنیف و تالیف اور نماز کی امامت وغیرہ کے ذریعے افراد کی تربیت میں مشغول ہیں اور اسی دوران میں انہوں نے ایک لاکھ سے زیادہ افراد کی ہدایت کی ہے لیکن ان سب میں انہیں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا کہ جس راہ کو وہ خود چاہتے ہیں وہ اس پر گامزن ہو۔[1]

جی ہاں! ہر صدی میں بہت کم ایسے افراد ہوتے ہیں جنہیں اس بات کی توفیق نصیب ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مادیت اور عالمِ طبیعت کے ہاتھوں نہیں بیچتے اور یوں صاحبِ اسرار بن جاتے ہیں

ساتواں نمونہ:- اہلِ ایمان کی گواہی:- قرآنی مثالوں میں ساتواں نمونہ

---

[1] روضۃ المتقین، ج ۱۳، ص ۱۲۸

جو ایک کلّی نمونہ ہے سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۵ میں آیا ہے:

"وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمؤمنون"

یعنی لوگوں سے کہہ دو کہ جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں خدا، رسول اور مومنین اسے دیکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ آیت میں مومنین کے مصداقِ کامل آئمہ طاہرین علیہم السلام ہیں جیسا کہ بعض روایات میں اس کا مصداق ان ہستیوں کو قرار دیا گیا ہے مثلاً ذیل کی یہ روایات:

"والمؤمنون ھم الائمۃ "یا" ایانا عنی"[1]

البتہ یہ تطبیق ہے نہ کہ تفسیر کیونکہ تفسیر کا لازمہ یہ ہے کہ "مومنون" کا لفظ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے لیے استعمال ہوا ہو حالانکہ اس طرح کی روایات میں تفسیری پہلو کی نسبت تطبیقی پہلو زیادہ ہے۔

مذکورہ آیت میں "مومنین" کا عنوان ذیل کی آیت میں "مومنین" سے مختلف ہے۔

"انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون"[2]

کیونکہ اس آیت کے اندر قرینہ موجود ہے کہ جو تمام مومنین کے شامل ہونے کی نفی کرتا ہے اور وہ قرینہ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دینے کا ہے اور یہ نہ تو حکم واجب ہے اور نہ ہی مستحب بلکہ اس بات پر شاہد ہے کہ یہ آیت ایک خاص قضیے کی نشاندہی کرتی ہے جو ایک خاص موقع پر وقوع پذیر ہوا۔

جبکہ زیرِ بحث آیت میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جو مومنین کو ——— محدود کرے لہٰذا اہلِ بیت علیہم السلام کے علاوہ دیگر افراد بھی اس میں شامل ہیں۔

یہ خیالِ خام ہے کہ گمان کیا جائے کہ آئمہ طاہرین کا مقام انسان کے اندرونی

---

[1] تفسیر صافی۔ مذکورہ آیت کے ذیل میں بیان شدہ روایات۔ [2] مائدہ - ۵۵

اسرار سے مطلع ہونے تک منحصر ہے کیونکہ اس طرح کی آگاہی ان نورانی ہستیوں کے لئے ایک معمولی سی بات ہے اور ہر مومن علیم محض سے اور ان ہستیوں سے جو معادنِ علمِ الٰہی ہیں قلبی رابطہ برقرار کرنے سے دوسروں کے اعمال پر مطلع ہو سکتا ہے۔

سورۂ مطففین کی آیات ۱۸ تا ۲۱ میں اس آگاہی کو ایک کلی اصول کے طور پر یوں یاد کیا گیا ہے:

"ان کتاب الابرار لفی علیین، وما ادرٰیک ما علیون کتاب مرقوم، یشھدہ المقربون"

یعنی جو کچھ نیک لوگ جانتے ہیں یا انجام دیتے ہیں وہ سب کچھ کتاب میں مسطور و مرقوم ہے اور وہ کتاب علیین میں ہے اور خود علیین ایک بہتر و برتر کتاب ہے جو اس کتاب پر محیط ہے اور مقربین اسے مشاہدہ کرتے ہیں۔ پس جو کچھ ابرار انجام دیتے ہیں مقربین اسے مشاہدہ کرتے ہیں۔

یہی حقیقت سورۂ حٰم السجدہ میں مذکورہ اصول سے بھی اخذ ہوتی ہے وہاں فرمایا گیا ہے:

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا" (حٰم السجدہ ۔ ۳۰)

یعنی جو لوگ استقامت کرتے ہیں ملائکہ ان پر نازل ہوتے ہیں اور انھیں خوف و حزن سے نجات دلاتے ہیں۔ اس آیت میں خوف و حزن کا ذکر تمثیل کے عنوان سے ہے کیونکہ ملک کا ثمرہ فقط خوف و حزن کی نفی نہیں بلکہ جو کچھ بھی مادی اور معنوی رزق ہے سب ملک کے ذریعے ہی نازل ہوتی ہے جیسا کہ سورۂ جن کی اس آیت میں بارش کے نزول کو استقامت کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"وان لو استقاموا علی الطریقۃ لاسقیناھم ماءً غدقا"

(جن ۔ ۱۶)

یعنی اگر وہ استقامت کرتے اور صحیح راستے سے منحرف نہ ہوتے تو ہم انہیں بہت سا پانی نصیب کرتے۔

مذکورہ آیت میں جس پانی کو صحیح طریقے پر استقامت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے فقط مادی پانی میں منحصر نہیں کہ نمازِ استسقاء وغیرہ کو آیت میں مذکور کبریٰ کے لیئے صغریٰ کے طور پر پیش کیا جائے بلکہ آبِ معرفت بھی اس میں شامل ہے جو روحِ انسان کے لیے معنوی و روحانی غذا ہے۔

اس بات کی دلیل وہ روایت ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہے:

"فلینظر الانسان الیٰ طعامہ" (عبس - ۲۴)

امام علیہ السلام نے اس آیت کے معنی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"فلینظر الانسان الیٰ علمہ الذی یأخذہ وعمّن یأخذہ"[1]

یعنی اللہ تعالےٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ "انسان کو اپنے طعام کی طرف دیکھنا چاہیئے" اس کا معنی یہ ہے کہ انسان کو ہوشیار رہنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنا علم کس سے حاصل کر رہا ہے۔

اگر اس آیت میں طعام سے مراد علم ہے کہ جو انسان کے لیے روحانی رزق ہے تو بعد کی آیات میں ذکر شدہ پانی یا زمین سے بھی ایسا پانی اور زمین مراد ہیں جو انسان کے لیے علم کی ترقی اور معرفت میں رشد کا باعث ہوں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول اس روایت میں نہ صرف طعام کا معنی علم کیا گیا ہے بلکہ علم کی نوعیت بھی بیان کی گئی ہے کیونکہ جس علم کے بارے میں انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے معلّم کو پہچانے اور ہر کسی سے یہ علم حاصل نہ کرے اور نہ ہی یہ ہر کسی کے بس کی بات ہے ایسا علم ہے جو انسانی روح کی

---

[1] اصول کافی، کتاب فضل العلم، باب النوادر حدیث ۸

تربیت اور تزکیے سے مربوط ہے ورنہ فزکس اور ریاضی جیسے علوم کے حصول میں جو کچھ قابلِ ذکر ہے، یہی اصول ہے کہ " لا تنظر الیٰ من قال وانظر الیٰ ما قال "[1] یعنی کہنے والے کی طرف مت دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دو حدیثیں آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتیں کیونکہ ہر ایک کا مورد دوسری سے جدا ہے۔

گذشتہ بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ استقامت کا نتیجہ صرف یہ نہیں کہ خوف و غم سے نجات دلانے کے لئے ملائکہ نازل ہوں اور بارش برسے بلکہ علوم الٰہی کی تعلیم اور انسان کے اندرونی اسرار سے آگاہی بھی طریقِ حق تعالےٰ پر استقامت کے من جملہ نتائج میں سے ہے۔ بنابرین جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت ۱۰۵ اس بات پر دلالت کر رہی ہے بہت سے ایسے مومنین ہمارے درمیان موجود ہیں جو ہمارے اعمال سے آگاہ ہیں اور ان سب سے بالاتر اور برتر آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔

یہاں تک ہم نے جن سات نمونوں کو ذکر کیا وہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور کرامات واضح و روشن ہیں اور ان کی ولایتِ تکوینی و تشریعی مسلّم ہے لیکن ان کے علاوہ بھی ایسے افراد موجود ہیں جو طریقہ الٰہی پر استقامت اور اللہ سے قلبی ارتباط کے نتیجے میں ولایتِ تکوینی پر فائز ہوتے ہیں۔

والحمد للہ رب العالمین

---

[1] صد کلمہ جاحظ۔

درس ۲۱

انسان کے ادراک و حرکت میں کارِ خدا کا ظہور

نظامِ تکوین میں ایسے انسانوں کے علمی اور عملی تصرفات کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جو پیغمبر نہ تھے اور یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ تصرفات اللہ تعالےٰ کے ساتھ ان کے غیبی ارتباط کی نشانی ہیں۔

ایک مشہور حدیث جو فریقین کی کتبِ حدیث میں موجود ہے اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ انسان تزکیۂ نفس کے ذریعے اُس مقام تک جا پہنچتا ہے کہ اس کے قوائے ادراکی حق تعالےٰ کے ادراک کا مظہر اور اس کی تحریکی قوتیں حق تعالیٰ کی قدرت و تحریک کا مظہر بن جاتی ہیں۔ یہ حدیث جسے کلینی مرحوم نے اپنی معتبر اور جامع کتاب (کافی) میں ذکر کیا ہے یہ ہے کہ قربِ نوافل کے ساتھ انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے کہ خداوند تعالےٰ اس کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

"وما تقرّب الیّ عبد بشیٔ احبّ الیّ ممّا افترضت علیہ و انّہ لیتقرّب الیّ بالنّافلۃ حتّیٰ احبّہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الّذی یسمع بہ و بصرہ الّذی یبصر بہ و لسانہ الّذی ینطق بہ و یدہ الّتی یبطش بہا، ان دعانی احببتہ وان سألنی اعطیتہ"[1]

یعنی ایک عابد و سالک انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے کہ ادراک و حرکت اگرچہ اس کی طرف سے ہے لیکن جس آنکھ سے وہ دیکھ رہا ہے وہ نگاہِ الٰہی ہے، جس کان سے وہ سُن رہا ہے وہ سمعِ الٰہی ہے اور جس ہاتھ سے وہ اپنی قدرت کا

---

[1] اصول کافی، کتاب الایمان والکفر، باب من اذی المسلمین،

مظاہرہ کر رہا ہے وہ دستِ خدا ہے اور وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کے علمی اور عملی کام اللہ تعالےٰ اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور وہ شخص مستجاب الدعوۃ ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کارِ خدا اُس کے ادراک و حرکت کے مظاہر میں ظہور کرتا ہے۔ البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ انسان جو بھی کارِ خیر انجام دیتا ہے اس کا مبداء اللہ تعالےٰ کی ذات ہے۔ اس بات پر عقلی دلیل یہ ہے کہ انسان ممکنات میں سے ہے اور ممکنات اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے واجب پر ختم ہوتی ہیں۔ اس بات پر قرآنی شاہد درج ذیل آیات ہیں:

"اللہ خالق کلّ شیٔ" (رعد - ۱۶)

"واللہ خلقکم وما تعملون" (صافات - ۹۶)

"وما بکم من نعمۃ فمن اللہ" (نحل - ۵۳)

معرفتِ نفس اور کشفِ ولایت کا طریقہ

یہ بات جاننے کے بعد کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو ولایت تک جا پہنچتے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "ولی اللہ" کو اپنی ولایت کا پتہ کیسے چلتا ہے؟

کتاب "محاسنِ برقی" کے مصنف نے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ پیغمبروں کو کیسے پتہ چلتا ہے کہ وہ پیغمبر ہیں؟

"کیف علمت الرّسل انّھا رسل؟"

یعنی انہیں کیسے پتا چلتا ہے کہ جو کچھ وہ مشاہدہ کرتے ہیں وہ شیطانی تخیلات و تمثلات نہیں بلکہ نبوت ہے؟ امام جعفر صادق علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"کُشِفَ عنھا الغطاء"

یعنی ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے اور وہ ایسے کشف و شہود کے ساتھ اپنی نبوت اور اپنے علم کی حقانیت کو سمجھ لیتے ہیں کہ جس میں ابہام و اجمال کی کوئی گنجائش نہیں رہتی جبکہ دوسرے لوگ اس کے برعکس برہان یا معجزے

کے ذریعے نبوت پیغمبر کو ثابت کرتے ہیں۔ ذہین وفطین راوی نے دوبارہ اپنے مولا سے سوال کیا کہ مومن اپنے آپ کو کس معیار ایمان سے آزمائش کرے جس سے اسے یقین ہو جائے کہ وہ مومن ہے؟

« بای شیء یعلم المؤمن انہ مؤمن » ؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

« بالتسلیم للہ والرضا بما ورد علیہ من سرور و سخط » [1]

یعنی مومن اس وقت اپنے آپ کو باایمان سمجھے جب وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے "تسلیم" پائے اور اسے پیش آنے والے پُرمسرت یا دردناک واقعات میں ہمیشہ وہ " رضا " کی حالت میں ہو۔

کلینی مرحوم نے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ نبی جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے اسے کیسے پتا چلتا ہے کہ یہ حق ہے اور صحیح ہے اور فرشتے کی طرف سے ہے؟

« قلت اصلحک اللہ کیف یعلم ان الذی رای فی النوم حق وانہ من الملک »

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

« یوفق لذلک حتی یعرفہ »

نبی کو ایک خاص قسم کی توفیق نصیب ہوتی ہے جس سے وہ پہچان لیتا ہے کہ جو کچھ وہ مشاہدہ کرتا ہے وہ حق ہے اور فرشتے کی طرف سے ہے۔

محاسن کی حدیث کو بھی کلینی مرحوم نے "کتاب الایمان والکفر" باب الرضا بالقضاء میں نقل فرمایا ہے۔

---

[1] محاسن برقی، ج ۲، ص ۳۲۸، حدیث نمبر ۸۵۔

یہ صادق اور بلند و بالا کلام قرآن کے جاری و ساری حیات بخش چشمے سے ایک جامِ زلال ہے اس میں قاطعانہ اعلان ہو رہا ہے:

"فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما" (نساء - ۶۵)

یعنی حقیقی مومن وہ ہے جو قوانینِ الٰہی کے سامنے دل و جان سے سلم محض ہو اور سلم کا معنی سکوت سے کچھ بالاتر ہے یعنی سکوت اطمینان و سکون کے ہمراہ ہو۔ اگر انسان اپنے علمی اور عملی اختلافات میں پیغمبر کی طرف رجوع کرے اور اس کے حکم کے سامنے بظاہر سکوت اختیار کرے لیکن دل میں تنگی کا احساس کرے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اہلِ ایمان نہیں۔

پس شناختِ ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ اندرونی معرفت اور فرمانِ الٰہی کے سامنے کیفیتِ تسلیم کو پرکھا جائے۔ جس طرح ایک پیغمبر یا ایک مومن اپنے نفس کے مکمل شہود اور احکامِ الٰہی کے ساتھ نفس کے برتاؤ سے اپنی نبوت یا ایمان سے مطلع ہوتا ہے اسی طرح اہلِ ولایت کو بھی اپنے نفس کی شناخت سے اپنی ولایت کا پتہ چلتا ہے۔ پس ولایت کو پہچاننے کی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے۔ لہٰذا اگر کوئی اپنے آپ سے غافل ہو تو وہ اللہ تعالےٰ سے اپنی ولایت یا عداوت کو سمجھ نہیں سکتا۔ اللہ تعالےٰ نفس کی فراموشی اور اس کی علت کے بارے میں یوں خبردار کرتا ہے:

"ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم" (حشر - ۱۹)

یعنی ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے بھی انہیں خود اپنی یاد بھلا دی۔ یعنی اپنی اصل اور مبداءِ ہستی کو بھلا دینے والے ہی خود اپنے آپ کو بھلا دینے کے درد میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مادیت اور عالمِ طبیعت میں سرگرم افراد کے بارے میں قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"اھمتھم انفسھم یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ" (آلِ عمران ۱۵۴)

یعنی وہ اپنے آپ میں کھوئے ہوئے ہیں اور جہالت کی وجہ سے اللہ پر گمانِ باطل کرتے ہیں۔

البتہ جو کچھ پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے (کہ انہوں نے اپنے آپ کو بھلا دیا ہے) اور جو کچھ دوسری آیت میں ارشاد ہوا ہے (کہ وہ صرف اپنے آپ میں مصروف ہیں) ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ جس "خود" کو بھلا دیا ہے وہ انسانی حقیقت واصالت ہے اور جس "خود" میں مشغول ہیں وہ حیوانی اور نباتاتی ہے جو غذائی ضروریات اور شہوات کو پورا کرنے کی حد تک ہے۔

خوارق کی اقسام اور معجزہ وکرامت میں فرق

خوارق کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جو چیز دعوئے نبوت کے اثبات کے لیئے نبی کے ہاتھوں ظاہر ہوتی ہے اسے معجزہ کہتے ہیں اور جو کچھ اولیاء انجام دیتے ہیں اسے کرامت کہا جاتا ہے۔

معجزہ اور کرامت کہ جو خوارق کی چار قسموں میں سے دو ہیں اس لحاظ سے کہ یہ دونوں نبی یا امام کی ولایتِ تکوینی کے ذریعے وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ ایک اور جہت سے ان میں فرق یہ ہے کہ معجزہ میں دعوائے نبوت کے ساتھ تحدی بھی ہے یعنی نبی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور معجزہ دکھانے کے ساتھ مبارز طلب کرتا ہے جبکہ کرامت میں ادّعا اور تحدی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ معجزے کی بحث بھی بحثِ ولایت ہی کے ضمن میں آتی ہے لیکن چونکہ یہ نبوت کی بحث سے مناسبت رکھتی ہے لہٰذا اسے مسألۂ نبوت میں ہی پیش کیا جائے گا۔ نبوت کی بحث میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ نبی کا ایک دعویٰ ہوتا ہے اور ایک دعوت۔ اس کا دعویٰ نبوت ہے جو معجزے کیساتھ

ہے اور اس کی دعوت توحید اور الٰہی معارف کی طرف ہوتی ہے۔

خوارق کی تیسری قسم جو عام مومنین کی دعا اور درخواست سے انجام پاتی ہے معونت اور اعانت کہلاتی ہے۔ خوارق کی چوتھی قسم کا نام اہانت ہے اور یہ وہ خارق العادہ ہے جو غیر مومن کے ہاتھوں خود اس کی تحقیر و توہین کے ساتھ صادر ہوتی ہے جیسا کہ منقول ہے کہ مسیلمہ کذاب نے ایک صحیح و سالم آنکھ پر ہاتھ پھیرا تو وہ آنکھ اندھی ہو گئی اور ایک کنویں میں لعاب دہن ڈالا تو اس کا پانی زیادہ ہونے کے بجائے خشک ہو گیا۔

اولیاء سے ظہور کرامت پر اعتراض اور اس کا جواب

اولیاء سے ظہور کرامت پر چند پہلوؤں سے اشکال کیا جاتا ہے ان میں سے اہم ترین اشکال یہ ہے کہ اگر معجزے کی مانند کوئی چیز غیر نبی سے بھی صادر ہو تو معجزے کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی اور اس طرح نبی اور غیر نبی میں بھی کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور یوں نبی کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں میں فرق تحدی اور دعوائے نبوت کے لحاظ سے ہے اور یہ فرق ثابت و مستقل ہے کیونکہ جب تک کوئی ولایت تک نہ پہنچے صاحب کرامت نہیں ہو سکتا اور ولی بھی احکام نبی پر عمل کے سوا کسی اور طریقے سے ولایت تک نہیں پہنچ سکتا پس جو بھی صاحب کرامت ہے وہ پیغمبر کا مطیع اور اس کی نبوت کا مقر ہے اور وہ نہ تو دعویٰ کرتا ہے اور نہ ہی تحدی خلاصہ یہ کہ ظہور کرامت غیر نبی سے ممکن ہے اور اس کے امکان پر بہترین دلیل اس کا واقع ہونا ہے کیونکہ آیات و روایات سے معلوم تاریخ ایسے اولیاء الٰہی کے ہاتھوں بہت سی کرامات کے ظہور پر ایک زندہ شاہد ہے جو پیغمبر نہ تھے۔

اولیائے الٰہی کے مختلف پہلو اور ان کی مصروفیات

اولیائے الٰہی کے بارے میں کہا گیا ہے:

"شُغْلُهُ بِاللّٰهِ وَفِرَارُهُ اِلَى اللّٰهِ وَهَمُّهُ لِلّٰهِ"

یعنی ولی اللہ ابتدائے کار اور انجام کار اور آغاز و انجام کے درمیانی فاصلے کے دوران میں صرف خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بنابریں اولیائے الٰہی تمام پہلوؤں سے حق تعالےٰ کی طرف متوجہ رہتے ہیں کیونکہ انسان ہر کام میں تین حالتوں سے باہر نہیں۔ یا وہ کام کے آغاز میں ہے یا اس میں مشغول ہے اور یا وہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اس سے فائدہ حاصل کر رہا ہے ان تمام پہلوؤں میں اولیاء الٰہی کی توجہ اور ان کے ہم و غم کا مرکز چونکہ حق تعالےٰ کی ذاتِ اقدس ہوتی ہے لہٰذا وہ اس آیۂ کریمہ کا زمزمہ کر سکتے ہیں۔

"ان صلاتی ونسکی و محیای ومماتی للّٰہ رب العالمین"

(انعام - ۱۶۲)

"روح القدس" کے ذریعے اولیاء الٰہی کی تائید

بعض آیات و روایات میں اولیاء الٰہی کے علمی اور عملی کاموں کو "روح القدس" کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

"اذ قال اللّٰہ یا عیسیٰ ابن مریم اذکر نعمتی علیک وعلیٰ والدتک اذ ایدتک بروح القدس تکلّم النّاس فی المھد وکھلاً"

یعنی اے عیسیٰؑ! اپنے اور اپنی ماں کے اوپر ہونے والی ہماری نعمتوں کو یاد کرو، اس وقت جب ہم نے روح القدس کے ذریعے تمہاری تائید کی اور تم نے بچپن اور ادھیڑ عمر میں لوگوں کے ساتھ باتیں کیں۔

یا سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۲ میں مؤمنین کے بارے میں آیا ہے:

"لا تجد قومًا یؤمنون باللّٰہ والیوم الاخر یوادّون

من حاد اللہ و رسولہ ولو کانوا اباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منہ "

یعنی ان لوگوں کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے ہیں ہرگز ایسے لوگوں کا دوست نہیں پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں اگرچہ یہ مخالفت کرنے والے ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی یا دیگر رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں یہ وہی مؤمنین ہیں اللہ تعالےٰ نے جن کے دلوں میں ایمان کو ثبت کیا ہے اور اپنی طرف سے اپنی روح کے ساتھ ان کی تائید کی ہے۔

اس آیت میں جس روح کا ذکر ہوا ہے درحقیقت وہ روح القدس کی طرف اشارہ ہے اور یہ اس روح سے جدا ہے جسے ان دو آیات میں ضمیرِ متکلم اور ضمیرِ غائب کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

" ونفخت فیہ من روحی " (حجر - ۲۹)

" ونفخ فیہ من روحہ " (سجدہ - ۹)

کیونکہ ان دو آیات میں جس روح کا ذکر کیا گیا ہے وہ تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے جبکہ زیرِ بحث آیت میں روح القدس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو صرف انسانِ کامل کی تائید کے لئے مختص ہے۔

کافی شریف کے باب " الارواح التی فی الائمۃ علیھم السّلام " میں بھی چند روایات ایسی ہیں جو اس معنی پر دلالت کرتی ہیں کہ عام افراد اور عام مؤمنین میں چار روحیں اور آئمہ طاہرین علیہم السلام میں پانچ روحیں ہوتی ہیں۔ ان روایات میں ان روحوں میں سے ہر ایک کی خصوصیات کو بھی ذکر کیا گیا ہے اور ہماری زیرِ بحث تائیدی روح کو آئمہ علیہم السّلام میں اسی پانچویں روح کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

جس چیز کو ہم یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ "روح القدس" انسان کی روح وجان سے جدا کوئی بیرونی حقیقت نہیں بلکہ خود نفسِ انسانی کا ایک بلند و بالا درجہ ہے جو اس سے نیچے والے درجات کو طے کرنے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ روحِ انسان کبھی تو اَمّارۃ بالسوء، کبھی لوّامہ، کبھی ملہمہ، کبھی مطمئنہ اور راضیہ و مرضیہ اور کبھی وہ روح القدس کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ارواح نفس ہی کی حدود و مراتب ہیں جنہیں یکے بعد دیگرے طے کیا جاتا ہے۔

جو کچھ اصولِ کافی شریف کی روایات میں آیا ہے اس سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ یہ پانچ روحیں ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک نفسِ انسانی ہی کا ایک جنبہ ہے۔ جب روح و نفسِ انسانی پانچویں مرتبے یعنی مرتبۂ قداست تک پہنچتا ہے تو ہر عیب و نقص سے منزہ ہو جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ ایسے خاص علمی اور عملی کام بجا لا سکتا ہے جو دوسرے کے بس کی بات نہیں۔

پس ایسا نہیں کہ اولیاءِ الٰہی کے کام ان کی روح سے جدا کسی "روح القدس" نامی فرشتے سے منسوب ہوں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ اولیاء کی روح ان کمالاتِ عینی سے جدا اور بے خبر ہے اگرچہ ایسے فرشتے بھی موجود ہیں جو مؤید و مدبرِ امور ہیں اور مقامِ قداست انہیں حاصل ہے۔ اس مدعا پر دلیل وہ جواب ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابوبصیر کے سوال پر بیان فرمایا[1] ابوبصیر نے سوال کیا کہ اس آیت میں روح سے مراد کون سی روح ہے؟

وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان[2]

---

[1] اصول کافی، باب الروح التی یسدد اللہ بہا الائمۃ علیہم السلام، حدیث نمبر ۱

[2] سورۂ شوریٰ - ۵۲

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ وہ روح جو اللہ تعالےٰ اپنے رسول پر نازل کرتا ہے جبرائیل اور اسرافیل علیہما السلام سے بھی عظیم تر ہے۔ اس روح کا نزول کہ جو فرشتۂ وحی سے بھی اعظم ہے فرشتہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس نفخۂ الٰہی کی وجہ سے ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح و جان میں واقع ہوا۔

گذشتہ بحث سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیئے بچپن میں روح القدس کے ذریعے جو تائید واقع ہوئی وہ درجاتِ روح کے سریع طے ہونے کی وجہ سے انجام پائی کیونکہ زمان، مکان اور درجات کو سرعت کے ساتھ طے کرنا ممکنات میں سے ہے۔ جو چیز ناممکن ہے وہ یہ ہے کہ نیچے والے درجات طے کئے بغیر درجاتِ عالیہ کو حاصل کیا جائے کیونکہ تمام اقسام میں طفرہ محال ہے۔

ولایتِ الٰہی کے مظاہر

اللہ تعالےٰ اپنے کام راہِ غیب سے کبھی تو انسان کے ہاتھوں انجام دیتا ہے اور کبھی غیر انسان کے ہاتھوں۔ ابرہہ کے حملے سے کعبے کی حفاظت کا واقعہ اللہ تعالیٰ کے غیبی کاموں میں سے اس کی ظہورِ ولایت کا ایک نمونہ ہے جو غیر انسان کے ذریعے ظاہر ہوا۔ قرآنِ مجید اس بارے میں سورۂ فیل میں ارشاد فرماتا ہے۔

"الم ترکیف فعل ربّك باصحاب الفیل، الم یجعل کیدھم فی تضلیل، وارسل علیھم طیرًا ابابیل، ترمیھم بحجارۃ من سجیل، فجعلھم کعصف مأکول"

یہ واقعہ جو محافظتِ دین کے لیے اللہ تعالےٰ کی قدرت کا ظہور تھا ممکن ہے کہ ہر دوسری جگہ اور ہر دوسری صورت میں ظاہر ہو۔ مثلاً اگر اولیائے الٰہی میں سے کوئی ایسا ولی خطرے میں ہو جو دین کا مظہرِ کامل ہو اور دینِ حق کی محافظت کا دارومدار

اس کی حفاظت پر ہو تو یہاں بھی اللہ تعالٰے اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن طریقے سے اپنی قدرت کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک کلی اصول جو ان تمام خوارق کا جامع ہے سنت الٰہی ہے کہ خداوند تعالٰے اپنے نور کا خود ہی محافظ ہے۔

"یریدون لیطفؤا نور اللہ بأفواھھم و اللہ

متم نورہ ولو کرہ الکافرون (صف - ۸)

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے وہ تمام موارد جہاں اللہ تعالٰے کی قدرتِ غیبی اور ظہورِ ولایت میں انسان کا ہاتھ ہے ان سب میں انسان کی وساطت اتفاقی طور پر نہیں بلکہ انسان اللہ تعالٰے اور عالمِ طبیعت و مادیت کے درمیان ایک حقیقی رابطہ ہے لہٰذا اس کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے خارق العادت کام کو حقیقتاً اس کی طرف نسبت دی جاسکتی ہے لیکن دوسروں کی طرف یہ نسبت نہیں دی جاسکتی۔

مثلاً حضرت عیسٰی علیہ السلام کا واقعہ کہ جس میں وہ چیزوں کو ابتدائی طور پر زندگی عطا کرتے تھے، خود ان کی تو صرف پھونک ہوتی تھی جو اذنِ خدا سے زندگی کا باعث بنتی تھی۔ قرآن کریم اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

"واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ

فیھا فتکون طیرًا باذنی" (مائدہ - ۱۱۰)

یعنی اس وقت کو یاد کرو جب تم نے میری اجازت سے پرندے کی صورت بنائی اور پھر اس میں پھونک ماری تو وہ صورت میری اجازت سے زندہ ہو گئی۔

یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ جس میں وہ مجدداً زندگی عطا کرتے تھے۔ وہ صرف کچھ پڑھتے تھے کہ جس سے مردہ حیوان دوبارہ زندہ ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالٰے اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

"ثم ادعھن یأتینک سعیًا" (بقرہ - ۲۶۰)

یعنی تم ان سربریدہ پرندوں کو آواز دو تو وہ سب تمہاری طرف آجائیں گے۔

ان تمام موارد میں جو چیز قابلِ توجہ ہے اور گذشتہ ابحاث میں جسے ہم نے بطور مدلل بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان موارد میں اولیائے الٰہی کی وساطت ولایتِ الٰہی کے نہ تو طول میں ہے اور نہ ہی عرض میں چاہے یہ تباین کے لحاظ سے ہو یا تشکیک کی صورت میں۔ بلکہ یہ صرف ولایتِ خدا کی مظہر، آیت اور نشانی ہونے کے لحاظ سے ہے۔ لہٰذا جب ایک چیز کسی دوسری چیز میں متجلی اور ظہور پذیر ہو تو اگر مظہر کا مشاہدہ کیا جائے تو فعل کو اس مظہر کی طرف نسبت دی جائے گی اور اگر ظاہر نظر آئے تو فعل ظاہر سے منسوب ہوگا۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ کرنا اس لحاظ سے تھا کہ وہ اسمِ "محیی" کے مظہر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا (مردہ چیزوں کا) دوبارہ زندہ کرنا اس جہت سے تھا کہ وہ اسمِ "معید" کے مظہر تھے۔ اور یہ دو حق تعالےٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہیں۔

بنابرین اولیاء کی حقیقی وساطت کی بازگشت اس معنی کی طرف ہے کہ وہ اس بلند و بالا مرحلے تک جا پہنچتے ہیں کہ حق تعالےٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے کسی اسم کا مظہر بن جاتے ہیں اور مظہر چونکہ ظاہر کا ہی نمونہ اور آیت ہے لہٰذا فقط ولایتِ الٰہی کی نشاندہی کرتا ہے بغیر اس کے کہ اس میں ذرہ بھر اضافہ کرے یا تھوڑی سی بھی کمی کرے۔

والحمد للہ رب العالمین

○

اسلام شناسی کے لیے

مصباح الہدیٰ

پبلیکیشنز کی

شائع کردہ کتب کا مطالعہ کریں

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر ۱-۲۴ الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور